الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ ﷺ

بفیضِ کرم: حضور سیدنا غوث الثقلین حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ

کام وہ لے لیجئے تم کو جو راضی کرے — ٹھیک ہو نام رضا تم پہ کروڑوں درود

بانی
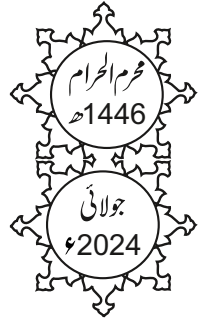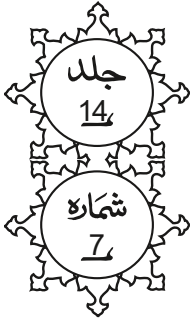
عطائے مفتی اعظم ہند حضرت مولانا محمد شاکر علی نوری (امیر سنی دعوت اسلامی)

مدیر مسئول
صادق رضا مصباحی

نائب مدیر
مظہر حسین علیمی

معاونین
شاہد رضا نجمی
توحید احمد علیمی

• رسالہ پڑھنے سے پہلے غور کریں کہ آپ کا سالانہ زرِ تعاون ختم تو نہیں ہو گیا اگر ایسا ہے تو فوراً منی آرڈر کے ذریعہ ممبری فیس روانہ فرما کر ممبر شپ برقرار رکھیں۔

مراسلت و ترسیل زر کا پتہ

پہلا منزلہ، فائن مینشن، ۱۳۲، کامبیکر اسٹریٹ ممبئی ۴۰۰۰۰۳

فی شمارہ	۲۰ روپے
سالانہ ممبری فیس	۲۵۰ روپے
تاحیات	۵۰۰۰ روپے
بیرونی ممالک	۲۵ امریکی ڈالر

SUNNI DAWAT E ISLAMI Monthly

1st Floor, Fine Mansion, 132 kambeker Street, Mumbai 400 003

Phone : (Off) 022-23451292//23434366 E mail : sdimonthly@gmail.com

پرنٹر پبلشر اور ایڈیٹر عرفان ابراہیم کلوڑی نے ٹاپ پرنٹرس سے طبع کرا کر آفس ماہنامہ "سنی دعوت اسلامی" سید عاشق شاہ بخاری مسجد فرسٹ فلور، ۱۲۸ رشیدا مارگ چارنل ڈونگری ممبئی سے شائع کیا۔ نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

مشمولات

اداریہ

امیر سنی دعوت اسلامی کے قلم سے

نام کے نہیں کام کے مومن بنیں!

واقعۂ کربلا کا ایک اہم سبق، جس سے ہماری زندگی یکسر خالی ہے

سیدالشہداء امام عالی مقام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات بابرکات کی کامیابی وکامرانی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ آپ مومن کامل تھے، آپ کی ذات میں سستی نہ تھی، آپ کے دل میں کسی قسم کا غم نہ تھا، مصائب وآلام میں ثابت قدمی اور استقامت جیسے اوصاف کا ہونا اس بات کی علامت اور شاہد ہیں کہ آپ کامل واکمل مومن تھے۔

آپ ذرا سوچیں! چودہ سو سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عزت وعظمت کا ڈنکا آج بھی بج رہا ہے اور بچے بچے کے دل میں امام حسین کی الفت ومودت موجود ہے، ان کی عظمت کے آگے ہر سر خم ہے اور دین مبین کی خاطر ان کی جفاکشی اور قربانی پر ہر زبان مدحت سرا ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

قرآن مقدس میں اللہ پاک نے اس فلسفے کو یوں بیان فرمایا ہے: وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ (المنافقون: ۸) ترجمہ: عزّت اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں ہی کے لیے ہے۔ مومن کی کیفیت اللہ عزوجل نے یہ بیان فرمائی: فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۔ (آل عمران: ۱۷۵) ترجمہ: (اے لوگو!) تم اُن سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو، اگر ایمان رکھتے ہو۔

اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ باطل سے ڈرنے کی بجائے رب سے ڈرنا یہ درحقیقت سچے مومن ہونے کا ثبوت ہے۔ جب کہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم سب سے ڈرتے ہیں لیکن رب سے نہیں ڈرتے۔ الا ماشاءاللہ!

آپ اگر امام حسین رضی اللہ عنہ کی حیات طیبہ کا مطالعہ کریں تو ان کی ذات اطہر ایک مومن کامل کے پیکر میں دنیا کے سامنے جلوہ گر نظر آئے گی۔

آپ میدانِ کربلا میں ۲۲ ہزار لشکر کے سامنے ڈٹے ہوئے استقامت کا عظیم مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ تاجدار کربلا نے کربلا کی طرف روانگی سے قبل اور وہاں پہنچنے کے بعد اپنے تمام رفقا اور اہل خانہ کو دین حق پر ثبات قدمی اور استقامت کی تعلیم دی۔ آپ کے قافلے میں آپ کے بچے، بیوی، بہن، بیٹی اور بھائی سبھی لوگ تھے۔ آپ کے مخالفین ظلم وسرکشی، عہد شکنی اور بے رحمی کا استعارہ تھے۔ قافلے کا حصار کرلیا گیا، معصوم بچوں کو بھی پانی سے محروم رکھا گیا، آپ تمام صورت حال کا مشاہدہ فرما رہے تھے اور جانتے تھے کہ یہ ظالم لوگ میرے ساتھ میرے اہل خانہ اور رفقائے سفر کو بھی شہید کردیں گے، میرے بچوں کو ظلم وبربریت کا نشانہ بنائیں گے، مگر ایسے عالم میں بھی آپ کا ایمان اس قدر کامل تھا، ذاتِ الٰہی پر اعتماد ویقین اس قدر محکم تھا کہ آپ کے پاؤں میں ذرہ برابر بھی لغزش نہیں آئی۔ یہی حال آپ کے رفقا اور اہل خانہ کا بھی تھا؛ ان کے دلوں میں یزید کا خوف بالکل نہیں تھا، کسی قسم کی کوئی گھبراہٹ نہ تھی، وہ قرآن مقدس کی اس آیت کا عملی پیکر بنے ہوئے تھے: وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ۔ (ھود: ۱۱۳) ترجمہ: تم ظالموں کی طرف ہرگز مت جھکنا، ورنہ تمھیں آتش دوزخ آ چھوئے گی۔ دوسرے مقام پر اللہ عزوجل نے یوں فرمایا: وَعَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ (التغابن: ۱۳) ترجمہ: اور مسلمانوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔

یہاں سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ حالات جس قدر بھی کشیدہ ہوجائیں، زمین تاحد نظر تنگ کردی جائے، مصائب وآلام کے پہاڑ ٹوٹنے لگیں، مومن کبھی نہیں گھبراتا ہے، اللہ تعالیٰ پر کامل یقین رکھتا ہے، ان حالات سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے اور تدبیریں اختیار کرتا ہے۔

اگر ہم مسلمان بھی کامیابی اور کامرانی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے اپنی زندگی سے سستی اور تساہلی کو نکال پھینکیں، مسلسل کوشش وجستجو کریں، سعیِ پیہم میں لگے رہیں، دنیوی حالات سے بے خوف ہوجائیں اور صرف خوفِ الٰہی کو دل میں جگہ دیں۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین کے لیے کامیابی کا وعدہ فرمایا ہے، لاریب اس کا وعدہ حق ہے، ہمیں بس مومنِ کامل بننا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو کمالِ ایمان کی دولت لازوال سے مالا مال فرمائے! امام حسین رضی اللہ عنہ اور شہدائے کربلا کی حیات طیبہ کو مشعل راہ بنانے کی توفیق بخشے!! آمین! ●●

سورۂ یوسف کے اسباق اور نصائح

مولانا محمد جابر خاں مصباحی

اس قصے کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ ایک مردِ مومن اگر حقیقی اسلامی سیرت رکھتا ہو اور حکمت سے بھی بہرہ یاب ہو، تو وہ محض اپنے اخلاق کے زور سے پورا ملک کو فتح کر سکتا ہے

سورۂ یوسف کا قرآنِ حکیم میں ایک منفرد مقام ہے۔ اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ سارے کا سارا ایک ہی جگہ اور ایک ہی ساتھ بیان کر دیا گیا ہے، جب کہ کتاب اللہ میں دوسرے قصص کا اسلوب اور انداز یہ ہے کہ موضوع سخن کے لحاظ سے جہاں ضروری ہو وہاں اتنا ہی بیان کر دیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے قصۂ یوسف دیگر قصص قرآنی سے ممتاز اور نمایاں ہے اور اسے 'احسن القصص' قرار دیا گیا ہے۔ سورۂ یوسف کی افادیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ اس میں ایک مومن کے لیے امید، حوصلہ اور کامیابی کا پیغام ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک فرد کی کس کس طرح سے مدد کرتا ہے اور بالآخر اسے منزلِ مقصود تک پہنچا کر رہتا ہے خواہ بظاہر اسے کیسے ہی مصائب کا سامنا ہو۔ اس سورہ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اس سے بہت سے اسباق اور نصائح اخذ ہوتے ہیں۔ یہاں چند پہلوؤں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے:

اللہ کی مدد اور نگرانی:

اللہ تعالیٰ انبیا علیہم السلام کی خصوصی نگرانی اور تربیت فرماتا ہے۔ اسی لیے ان پر وحی کا مسلسل نزول ہوتا ہے۔ پیغمبرانہ مشن، زندگی کی تگ و دو، کٹھن حالات اور مصائب وآلام میں ان کو ہمت وحوصلہ، استقامت واستقلال اور ایمان ویقین کی دولت عطا کی جاتی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے اسوہ میں ہمیں بارہا ایسے مواقع نظر آتے ہیں۔ حضرت یوسف کے بھائیوں نے انھیں اندھے کنویں میں پھینک دیا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں وحی کی کہ ایک وقت آئے گا جب تو ان لوگوں کو ان کی حرکت جتائے گا، یہ اپنے فعل کے نتائج سے بے خبر ہیں (یوسف: آیت ۱۵)۔ اسی طرح عزیزِ مصر کی بیوی نے جب انھیں رِجھانے کی کوشش کی تو اللہ نے ان کی مدد کی۔ بظاہر انھیں جیل میں قید کیا گیا لیکن یہی جیل ان کے لیے عظمت وسربلندی کا ذریعہ ثابت ہوئی۔

برادرانِ یوسف اپنے بھائی یوسف کو کنوئیں میں پھینک کر اپنے والد یعقوب علیہ السلام کے پاس پہنچے اور ان کے سامنے یوسف کو بھیڑیے کے کھا جانے کا ڈرامہ رچایا تو بوڑھے باپ پیغمبر یعقوب علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ہمت وحوصلہ عطا فرمایا اور انھوں نے کہا میں اس پر صبر کروں گا اور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگوں گا۔ (آیت: ۱۷-۱۸) اسی طرح جب حضرت یوسف مصر سے اپنے والد حضرت یعقوب کے لیے اپنی قمیص روانہ کرتے ہیں تو یہ ایک نشانی تھی کہ یوسف زندہ ہیں۔ حضرت یعقوب کنعان میں ان کی خوشبو سونگھ لیتے ہیں۔ پھر جب خوش خبری لانے والا آیا تو اس نے حضرت یوسف کا قمیص حضرت یعقوب کے منہ پر ڈال دیا اور یکا یک ان کی بینائی لوٹ آئی۔ ایک عام انسان کے لیے بھی اس میں رہنمائی ہے کہ انسان کو زندگی میں پیش آنے والی رکاوٹوں اور آزمائشوں سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ اگر وہ اپنے رب کی رضا اور خوشنودی کے پیش نظر جدوجہد کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی رہنمائی اور مدد کرتا ہے اور بالآخر وہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ کر رہتا ہے۔

آزمائش: تربیت اور سربلندی کا ذریعہ

بعض دفعہ اللہ تعالیٰ کٹھن، غیر معمولی اور آزمایش کے حالات میں مبتلا کر کے انسان کی تعلیم وتربیت اور آیندہ کی قسمت تعمیر کرتا ہے۔ حضرت یوسف کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اس آیت قرآنی کا بھی یہی مفہوم ہے:

اس طرح ہم نے یوسف کے لیے اس سرزمین (مصر) میں قدم جمانے کی صورت نکالی اور اسے معاملہ فہمی کی تعلیم دینے کا انتظام کیا۔ (آیت ۲۰)

کنعان اور شمالی عرب کے علاقے میں اس وقت نہ کوئی منظم ریاست تھی اور نہ تمدن وتہذیب نے کوئی بڑی ترقی کی تھی۔ کچھ آزاد قبائل تھے جو وقتاً فوقتاً ہجرت کرتے رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کو حضرت یوسف سے جو کام لینا تھا، اس کی تعلیم وتربیت کے لیے انھیں ریگستان

 پرنسپل دار العلوم اشاعت الحق ہلدوانی، نینی تال۔

سے نکال کر مصر جیسے تہذیب یافتہ ملک میں پہنچایا۔ اس تجربے اور بصیرت کے حصول کے لیے حضرت یوسف کی قسمت انہیں سلطنتِ مصر کے ایک اعلیٰ عہدے دار کے گھر لے آئی اور اس شخص نے حضرت یوسف کی صلاحیتوں کو دیکھ کر اپنی جاگیر یا ریاست کا انتظام ان کے حوالے کر دیا۔ اس طرح ایک چھوٹی سی ریاست کے ذریعے انھیں وہ انتظامی اور سیاسی تجربہ حاصل ہوگیا جو آیندہ ایک بڑی ریاست کے امور سنبھالنے کے لیے ضروری تھا۔

آزاد خیال طبقے کی روش:

اس سورت میں آزاد خیال طبقے کی تصویر بھی دکھائی گئی ہے اور اس زمانے میں مصر کے اُونچے طبقے کی خواتین کی معاشرتی و اخلاقی حالت کا نقشہ بھی کھینچا گیا ہے:

جب (زلیخا کے) شوہر نے دیکھا کہ یوسف کا قمیص پیچھے سے پھٹا ہوا ہے تو اس نے (حضرت یوسف کی پاک دامنی ثابت ہوتے اور زلیخا کے جرم کو دیکھ کر) کہا: یہ تم عورتوں کی چالاکیاں ہیں، واقعی بڑے غضب کی ہوتی ہیں تمھاری چالیں۔ یوسف کو اس معاملے سے درگزر کر اور اے عورت! تو اپنے قصور کی معافی مانگ، تو ہی اصل میں خطا کار تھی۔ (آیت: ۲۷-۲۹)

اس وقت کی زنانِ مصر کی ایک تکیہ دار مجلس کا منظر اس طرح بیان کیا گیا ہے:

شہر کی عورتیں آپس میں چرچا کرنے لگیں کہ ''عزیز کی بیوی اپنے نوجوان غلام کے پیچھے پڑی ہوئی ہے، محبت نے اس کو دیوانہ کر رکھا ہے، ہمارے نزدیک تو وہ صریح غلطی کر رہی ہے''۔ زلیخا نے جو اُن کی یہ مکارانہ باتیں سنیں تو ان کو بلا وا بھیج دیا اور ان کے لیے تکیہ دار مجلس آراستہ کی اور ضیافت میں ہر ایک کے آگے ایک ایک چھری رکھ دی۔ (پھر عین اس وقت، جب کہ وہ پھل کاٹ کاٹ کر کھا رہی تھیں) اس نے یوسف کو اشارہ کیا کہ ان کے سامنے نکل آ۔ جب ان عورتوں کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ دنگ رہ گئیں اور اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھیں اور بے ساختہ پکار اُٹھیں: ''حاشاللہ! یہ شخص انسان نہیں ہے، یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے''۔ (آیت: ۳۰-۳۱)

یہ اس وقت کے مصر کی اُونچے طبقے کی عورتوں کی اخلاقی اور معاشرتی حالت تھی کہ ایک پُر رونق مجلس امیر و کبیر مصری خواتین کی سجائی گئی اور اس میں زلیخا نے اپنے خوب صورت محبوب کو دکھایا اور انھیں قائل کرنے کی کوشش کی گئی کہ تم بتاؤ میں ایسے حسین نوجوانوں پر مروں نہ تو کیا کروں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آزاد منش، عیاش، آوارہ مزاج اور جنسی ہوس کے شکار لوگوں کا رویہ اور بے باکی، ہر دور میں ایک ہی رہی ہے۔ یہ کوئی نئی چیز، روشن خیالی، نرمی اور نئی تہذیب نہیں ہے بلکہ پرانی اور گھسی پٹی تاریک خیالی، تنزل، بدتہذیبی اور جاہلیت اور دقیانوسیت ہی ہے۔

آزمایش میں مومن کا رویہ:

اس سورت میں متقی، پرہیزگار اور نیک لوگوں کے ایمان کی وہ کیفیت بھی بیان کی گئی ہے جو آزمایش کے مرحلے میں ان کی ہوتی ہے کہ ان کا خدا پر ایمان اور اپنے اُوپر ضبط کمال کا ہوتا ہے۔ ان پر بڑے سے بڑا حربہ ناکام ہوتا ہے۔ وہ نازک لمحات میں بڑے سے بڑے لالچ و ترغیب میں نہیں پھنستے۔ ایسے موقع پر بھی وہ خدا سے مدد، توفیق اور دعا کرتے ہیں۔ ان کا خدا پر یقین پختہ ہوتا ہے اور ان کے دل و دماغ پر خدا کا احساس ہر وقت طاری ہوتا ہے، اور زبان پر خدا کا ذکر جاری ہوتا ہے یہاں تک کہ گناہِ کبیرہ سے بچنے کے لیے بڑی سے بڑی تکلیف قید تک کو قبول کر لیتے ہیں۔ ذیل کی آیات میں ایمان اور آزمایش کی کش مکش کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

عزیز کی بیوی نے (اپنی محفل کی سہیلیوں سے) کہا: دیکھ لیا! یہ ہے وہ شخص جس کے معاملے میں تم مجھ پر باتیں بناتی تھیں۔ بے شک میں نے اسے رِجھانے کی کوشش کی تھی مگر یہ بچ نکلا۔ اگر یہ میرا کہنا نہ مانے گا تو قید کیا جائے گا اور بہت ذلیل و خوار ہوگا۔ یوسف نے کہا: اے میرے رب! مجھے قید منظور ہے بہ نسبت اس کے کہ میں وہ کام کروں جو یہ لوگ مجھ سے چاہتے ہیں، اور اگر تو نے ان کی چالوں کو مجھ سے دفع نہ کیا تو میں ان کے دام میں پھنس جاؤں گا اور جاہلوں میں شامل ہو رہوں گا۔ (آیت: ۳۲-۳۴)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی شخص کو شرائط انصاف کے مطابق عدالت میں مجرم ثابت کیے بغیر بس یونہی پکڑ کر جیل بھیج دینا، بے ایمان حکمرانوں کا پرانا طریقہ رہا ہے۔ اس معاملے میں بھی آج کے شیاطین چار ہزار برس پہلے کے اشرار سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ فرق اگر ہے تو بس یہ کہ وہ 'جمہوریت' کا نام نہیں لیتے تھے اور یہ

اپنے اِن کرتوتوں کے ساتھ یہ نام بھی لیتے ہیں۔ وہ قانون کے بغیر اپنی غیر قانونی حرکتیں کیا کرتے تھے، اور یہ ہر ناروا زیادتی کے لیے پہلے ایک قانون بنا لیتے ہیں۔ وہ صاف صاف اپنی اغراض کے لیے لوگوں پر دست درازی کرتے تھے اور یہ جس پر ہاتھ ڈالتے ہیں اس کے متعلق دنیا کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اُس سے اِن کو نہیں بلکہ ملک اور قوم کو خطرہ تھا۔ غرض وہ صرف ظالم تھے۔ یہ اس کے ساتھ جھوٹے اور بے حیا بھی ہیں۔

حکمتِ دعوت:

قید خانے میں حضرت یوسف کی سیرت و کردار سے متاثر ہو کر دو قیدی اپنے خوابوں کی تعبیر پوچھنے کے لیے آپ کے پاس آتے ہیں۔ موقع کا فائدہ اُٹھا کر یوسف علیہ السلام اپنی دعوتِ توحید ان کے سامنے نہایت ہی دانائی، حکمت، مؤثر اور مدلل انداز میں پیش کرتے، اس کے بعد ان کو ان کے خوابوں کی تعبیر بتاتے۔ آپ نے فرمایا:

اے زنداں کے ساتھیو! تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے۔ اس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو، وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمھارے آباو اجداد نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔ فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی خالص اور سیدھا طریق زندگی ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (آیت: ۳۹-۴۰)

حضرت یوسف کی یہ تقریر اس پورے قصے کی جان ہے اور خود قرآن میں بھی توحید کی بہترین تقریروں میں سے ہے۔ اس کے متعدد پہلو ایسے ہیں جن پر توجہ اور غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ حضرت یوسف نے جس طرح اپنی تبلیغ کے لیے موقع نکالا اس میں ہم کو حکمتِ تبلیغ کا ایک اہم سبق ملتا ہے۔ دو آدمی اپنا خواب بیان کرتے ہیں اور اپنی عقیدت مندی کا اظہار کرتے ہوئے اس کی تعبیر پوچھتے ہیں۔ جواب میں آپ فرماتے ہیں کہ تعبیر تو میں تمھیں ضرور بتاؤں گا مگر پہلے یہ سن لو کہ اس علم کا ماخذ کیا ہے جس کی بنا پر میں تمھیں تعبیر دیتا ہوں۔ اس طرح ان کی بات میں سے اپنی بات کہنے کا موقع نکال کر آپ اُن کے سامنے اپنا دین پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ فی الواقع کسی شخص کے دل میں اگر تبلیغِ حق کی دُھن سمائی ہو اور وہ حکمت بھی رکھتا ہو تو کیسی خوب صورتی کے ساتھ وہ گفتگو کا رُخ اپنی دعوت کی طرف پھیر سکتا ہے۔ جسے دعوت کی دُھن لگی ہوئی نہیں ہوتی اس کے سامنے تو مواقع پر مواقع آتے ہیں اور وہ کبھی محسوس نہیں کرتا کہ یہ موقع ہے اپنی بات کہنے کا مگر وہ جسے دُھن لگی ہوتی ہے وہ موقع کی تاک میں لگا رہتا ہے اور اسے پاتے ہی اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ البتہ بہت فرق ہے حکیم کی موقع شناسی میں اور اُس نادان مبلغ کی بھونڈی تبلیغ میں جو موقع و محل کا لحاظ کیے بغیر لوگوں کے کانوں میں زبردستی اپنی دعوت ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر لیچڑ پن اور جھگڑالو پن سے انھیں اُلٹا متنفر کر کے چھوڑتا ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ لوگوں کے سامنے دعوتِ دین پیش کرنے کا صحیح ڈھنگ کیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام چھوٹتے ہی دین کے تفصیلی اصول اور ضوابط پیش کرنے شروع نہیں کر دیتے بلکہ ان کے سامنے دین کے اُس نقطۂ آغاز کو پیش کرتے ہیں جہاں سے اہلِ حق کا راستہ اہلِ باطل کے راستے سے جدا ہوتا ہے، یعنی توحید اور شرک کا فرق۔ پھر اس فرق کو وہ ایسے معقول طریقے سے واضح کرتے ہیں کہ عقلِ عام رکھنے والا کوئی شخص اسے محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خصوصیت کے ساتھ جو لوگ اس وقت ان کے مخاطب تھے ان کے دل و دماغ میں تو تیر کی طرح یہ بات اُتر گئی، کیونکہ وہ نوکر پیشہ غلام تھے اور اپنے دل کی گہرائیوں میں اس بات کو خوب محسوس کر سکتے تھے کہ ایک آقا کا غلام ہونا بہتر ہے یا بہت سے آقاؤں کا اور سارے جہان کے آقا کی بندگی بہتر ہے یا بندوں کی بندگی۔ پھر حضرت یوسف یہ بھی نہیں کہتے کہ اپنا دین چھوڑو اور میرے دین میں آ جاؤ، بلکہ ایک عجیب انداز میں ان سے کہتے ہیں کہ دیکھو! اللہ کا یہ کتنا بڑا فضل ہے کہ اس نے اپنے سوا ہم کو کسی کا بندہ نہیں بنایا مگر لوگ اس کا شکر ادا نہیں کرتے اور خواہ مخواہ خود گھڑ گھڑ کر اپنے رب بناتے اور ان کی بندگی کرتے ہیں۔ پھر وہ اپنے مخاطبوں کے دین پر تنقید بھی کرتے ہیں مگر نہایت معقولیت کے ساتھ اور دل آزاری کے ہر شائبے کے بغیر۔ بس اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ یہ معبود جن میں سے کسی کو تم اَن داتا، کسی کو خداوند نعمت، کسی کو مالکِ زمین اور کسی کو ربِّ دولت وغیرہ کہتے ہو، یہ سب خالی خولی نام ہی ہیں۔ ان ناموں کے پیچھے کوئی

حقیقی اَن داتائی وخداوندی اور مالکیت و ربوبیت موجود نہیں ہے۔ اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے جسے تم بھی کائنات کا خالق ورب تسلیم کرتے ہو اور اُس نے اِن میں سے کسی کے لیے بھی معبودیت کی کوئی سند نہیں اتاری ہے۔ اس نے تو فرماں روائی کے سارے حقوق اور اختیارات اپنے ہی لیے مخصوص رکھے ہیں اور اس کا حکم ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔

غلبۂ دین کے لیے حصولِ اقتدار:

ان دنوں شاہِ مصر کو ایک خواب نظر آیا۔ بادشاہ نے اپنے درباریوں سے اپنے خواب کی تعبیر پوچھی۔ اب وہ قیدی جو ایک عرصے تک حضرت یوسف کے ساتھ جیل میں رہا تھا اور اس وقت وہ مقرب شاہی میں داخل تھا، اسے یاد آیا کہ حضرت یوسف ہمیں خوابوں کی تعبیر بتاتے تھے اور وہ صحیح نکلتی تھی۔ وہ بادشاہ سے اجازت لے کر قید خانے میں گیا اور یوسف کو بادشاہ کا خواب بتایا۔ حضرت یوسف نے اس کی تعبیر بتادی جو صحیح ثابت ہوئی۔ اس پر شاہِ مصر نے حضرت یوسف کو مقرب شاہی بنانے کے لیے جیل سے بلایا تو انہوں نے کہلا بھیجا کہ پہلے اس الزام کی تحقیق کر لیجیے جو میرے کردار پر لگایا گیا تھا۔ بادشاہ نے محفل کی تمام عورتوں کو بلوایا۔ ان سب نے گواہی دی کہ یوسف میں ہم نے کوئی اخلاقی کمزوری نہیں دیکھی۔ یہاں تک کہ زلیخا بھی بول اُٹھی کہ دراصل میری نیت میں ہی فتور آ گیا تھا۔ یوسف بے شک ایک پاک دامن شخص ہے۔ یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی ثابت ہونے کے بعد شاہِ مصر نے تمام اقتدار سلطنت حضرت یوسف کے سپرد کر دیا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یوسف نے یہ اختیارات کس غرض کے لیے مانگے تھے؟ انھوں نے اپنی خدمات اس لیے پیش کی تھیں کہ ایک کافر حکومت کے نظام کو اس کے کافرانہ اصول و قوانین ہی پر چلائیں؟ یا ان کے پیشِ نظر یہ تھا کہ حکومت کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے کر ملک کے نظامِ تمدن و اخلاق و سیاست کو اسلام کے مطابق ڈھال دیں؟ اس سوال کا بہترین جواب وہ ہے جو علامہ زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

’’حضرت یوسف نے اِجۡعَلۡنِیۡ عَلٰی خَزَآئِنِ الۡاَرۡضِ جو فرمایا تو اس سے ان کی غرض صرف یہ تھی کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے احکام جاری کرنے اور حق قائم کرنے اور عدل پھیلانے کا موقع مل جائے اور وہ اُس کام کو انجام دینے کی طاقت حاصل کر لیں جس کے لیے انبیا بھیجے جاتے ہیں۔ انھوں نے بادشاہی کی محبت اور دنیا کے لالچ میں یہ مطالبہ نہیں کیا تھا بلکہ یہ جانتے ہوئے کیا تھا کہ کوئی دوسرا شخص ان کے سوا ایسا نہیں ہے جو اس کام کو انجام دے سکے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اقتدار، سیاست اور حکومت ایمان والوں کے لیے کوئی شجر ممنوعہ نہیں ہے۔ معاشرے کی اصلاحِ احوال، امن و امان، خدمتِ خلق، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور فلاحِ عامہ کے لیے نیک سیرت اور باکردار لوگ اس میں شریک ہو سکتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اللہ کے پیغمبر حضرت یوسف، حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور نبی آخری الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت کامیابی سے اسلامی ریاستیں چلائی ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ یاد رہے کہ یہ سلطنت وحکومت اور اقتدار واختیار دو دھاری تلوار کا نام ہے۔ یہ قوت نہایت ہی احتیاط، ذہانت، قابلیت، دانش مندی، تقویٰ اور خدا کی توفیق چاہتی ہے۔ یہ انسانی فلاح و کامرانی کا زینہ بھی ہے اور خسران و ناکامی کا گڑھا بھی۔ اسی لیے اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ آخرت کا اجر ان لوگوں کے لیے زیادہ بہتر ہے جو ایمان لائے اور خدا ترسی کے کام کرتے رہے۔

تدبیر اور توکل:

اس قصے میں تدبیر اور توکل کا سبق بھی موجود ہے۔ انسان کو اپنے کام نہایت ہی سوچ بچار، تدبیر، احتیاط، منصوبہ بندی اور تمام حالات کا جائزہ لے کر شروع کرنے چاہیے اور اللہ پر بھروسہ وتوکل کر کے نتیجہ اس اعلیٰ ذات پر چھوڑ دینا چاہیے۔ اس کے بعد جو بھی نتیجہ نکلے اسے اللہ کی مشیت اور مرضی سمجھ کر قبول کر لینا چاہیے۔ جیسا کہ حضرت یعقوب نے اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے بچوں کو مصر میں داخلے کے وقت احتیاطاً مختلف دروازوں سے داخل ہونے کی ہدایت کی مگر ان کی تدبیر اللہ کی مشیت کے مقابلے میں کچھ بھی کام نہ آسکی۔

تدبیر اور توکل کے درمیان یہ ٹھیک ٹھیک توازن جو ہم حضرت یعقوب کے مذکورہ بالا اقوال میں پاتے ہیں، یہ دراصل علمِ حقیقت کے اس فیضان کا نتیجہ تھا جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان پر ہوا تھا۔ ایک طرف وہ عالمِ اسباب کے قوانین کے مطابق تمام ایسی تدبیریں کرتے ہیں جو عقل وفکر اور تجربے کی بنا پر اختیار کرنی ممکن تھیں۔ بیٹوں کو ان کا

پہلا جرم یاد دلا کر زجر وتنبیہ کرتے ہیں تا کہ وہ دوبارہ ویسا ہی جرم کرنے کی جراءت نہ کریں، ان سے خدا کے نام پر عہد و پیمان لیتے ہیں کہ سوتیلے بھائی کی حفاظت کریں گے اور وقت کے سیاسی حالات کو دیکھتے ہوئے جس احتیاطی تدبیر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اسے بھی استعمال کرنے کا حکم دیتے ہیں تا کہ اپنی حد تک کوئی خارجی سبب بھی ایسا نہ رہنے دیا جائے جو ان لوگوں کے گھر جانے کا موجب ہو۔ مگر دوسری طرف ہر آن یہ بات ان کے پیش نظر ہے اور اس کا بار بار اظہار کرتے ہیں کہ کوئی انسانی تدبیر اللہ کی مشیت کو نافذ ہونے سے نہیں روک سکتی اور اصل حفاظت اللہ کی حفاظت ہے اور بھروسہ اپنی تدبیروں پر نہیں بلکہ اللہ ہی کے فضل پر ہونا چاہیے۔

عظمت کردار:

سورۂ یوسف میں حضرت یوسف کی ایک دعا کا تذکرہ بھی ہے۔ اپنے خواب کی تعبیر سچ ہونے پر انھوں نے اللہ تعالیٰ سے یوں دعا کی:

اے میرے رب! تو نے مجھے حکومت بخشی اور مجھ کو باتوں کی تہہ تک پہنچنا سکھایا۔ زمین و آسمان کے بنانے والے! تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا سرپرست ہے، میرا خاتمہ اسلام پر کر اور مجھے صالحین کے ساتھ ملا۔ (آیت:۱۰۱)

یہ چند فقرے جو اس موقع پر حضرت یوسف کی زبان سے نکلے ہیں ہمارے سامنے ایک سچے مومن کی سیرت کا عجیب دل کش نقشہ پیش کرتے ہیں۔ صحرائی گلہ بانوں کے خاندان کا ایک فرد، جس کو خود اس کے بھائیوں نے حسد کے مارے ہلاک کر دینا چاہا تھا، زندگی کے نشیب و فراز دیکھتا ہوا بالآخر دنیوی عروج کے انتہائی مقام پر پہنچ گیا ہے۔ اس کے قحط زدہ اہلِ خاندان اب اس کے دست نگر ہو کر اس کے حضور آئے ہیں اور وہ حاسد بھائی بھی، جو اس کو مار ڈالنا چاہتے تھے، اس کے تخت شاہی کے سامنے سرنگوں کھڑے ہیں۔ یہ موقع دنیا کے عام دستور کے مطابق فخر جتانے، ڈینگیں مارنے، گلے اور شکوے کرنے اور طعن و ملامت کے تیر برسانے کا تھا مگر ایک سچا خدا پرست انسان اس موقع پر کچھ دوسرے ہی اخلاق ظاہر کرتا ہے۔ وہ اپنے اس عروج پر فخر کرنے کے بجائے اس خدا کے احسان کا اعتراف کرتا ہے جس نے اسے یہ مرتبہ عطا کیا۔ وہ خاندان والوں کو اُس ظلم وستم پر کوئی ملامت نہیں کرتا جو اوائل عمر میں انھوں نے اس پر کیے تھے۔ اس کے برعکس وہ اس بات پر شکر ادا کرتا ہے کہ خدا نے اتنے دنوں کی جدائی کے بعد ان لوگوں کو مجھ سے ملایا۔ حاسد بھائیوں کے خلاف شکایت کا ایک لفظ زبان سے نہیں نکالتا حتیٰ کہ یہ بھی نہیں کہتا کہ انھوں نے میرے ساتھ برائی کی تھی بلکہ ان کی صفائی خود ہی اس طرح پیش کرتا ہے کہ شیطان نے میرے اور ان کے درمیان برائی ڈال دی تھی۔ اور پھر اس برائی کے بھی بُرے پہلو چھوڑ کر اس کا یہ اچھا پہلو پیش کرتا ہے کہ خدا جس مرتبے پر مجھے پہنچانا چاہتا تھا اس کے لیے یہ لطیف تدبیر اُس نے فرمائی یعنی بھائیوں سے شیطان نے جو کچھ کرایا اسی میں حکمتِ الٰہی کے مطابق میرے لیے خیر تھی۔ چند الفاظ میں یہ سب کچھ کہہ جانے کے بعد وہ بے اختیار اپنے خدا کے آگے جھک جاتا ہے، اس کا شکر ادا کرتا ہے کہ تو نے مجھے بادشاہی دی اور وہ قابلیتیں بخشیں جن کی بدولت میں قید خانے میں سڑنے کے بجائے آج دنیا کی سب سے بڑی سلطنت پر فرماں روائی کر رہا ہوں۔ اور آخر میں خدا سے کچھ مانگتا ہے تو یہ کہ دنیا میں جب تک زندہ رہوں تیری بندگی و غلامی پر ثابت قدم رہوں اور جب اس دنیا سے رخصت ہوں تو مجھے نیک بندوں کے ساتھ ملا دیا جائے۔ کس قدر بلند اور کتنا پاکیزہ ہے یہ نمونۂ سیرت۔

حق غالب آکر رہتا ہے:

اس قصے سے قرآنِ حکیم ایک اور گہری حقیقت بھی انسان کے ذہن نشین کرتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کام کرنا چاہتا ہے وہ بہر حال پورا ہو کر رہتا ہے۔ انسان اپنی تدبیروں سے اُس کے منصوبوں کو روکنے اور بدلنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا بلکہ بسا اوقات انسان ایک کام اپنے منصوبے کی خاطر کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں نے ٹھیک نشانے پر تیر مار دیا مگر نتیجے میں ثابت ہوتا ہے کہ اللہ نے اسی کے ہاتھوں سے وہ کام لے لیا جو اس کے منصوبے کے خلاف اور اللہ کے منصوبے کے عین مطابق تھا۔ یوسف علیہ السلام کے بھائی جب ان کو کنوئیں میں پھینک رہے تھے تو ان کا گمان تھا کہ ہم نے اپنی راہ کے کانٹے کو ہمیشہ کے لیے ہٹا دیا مگر فی الواقع انھوں نے حضرت یوسف کو اُس بامِ عروج کی پہلی سیڑھی پر اپنے ہاتھوں لا کھڑا کیا جس پر اللہ ان کو پہنچانا چاہتا تھا اور اپنی اس حرکت سے انھوں نے خود اپنے لیے اگر کچھ کمایا تو بس یہ کہ حضرت یوسف کے بامِ عروج پر پہنچنے کے

بعد بجائے اس کے کہ وہ عزت کے ساتھ اپنے بھائی کی ملاقات کو جاتے انھیں ندامت وشرمساری کے ساتھ اسی بھائی کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا۔

عزیز مصر کی بیوی حضرت یوسف کو قید خانے بھجوا کر اپنے نزدیک تو اُن سے انتقام لے رہی تھی مگر فی الواقع اس نے ان کے لیے تختِ سلطنت پر پہنچنے کا راستہ صاف کیا اور اپنی اس تدبیر سے خود اپنے لیے اس کے سوا کچھ نہ کمایا کہ وقت آنے پر فرماں روائے ملک کی مربیہ کہلانے کے بجائے اس کو علی الاعلان اپنی خیانت کے اعتراف کی شرمندگی اُٹھانا پڑی۔ یہ محض دو چار مستثنیٰ واقعات نہیں ہیں بلکہ تاریخ ایسی بے شمار مثالوں سے بھری پڑی ہے جو اس حقیقت کی گواہی دیتی ہیں کہ اللہ جسے اٹھانا چاہتا ہے، ساری دنیا مل کر بھی اس کو نہیں گرا سکتی بلکہ دنیا جس تدبیر کو اس کے گرانے کی نہایت کارگر اور یقینی تدبیر سمجھ کر اختیار کرتی ہے، اللہ اسی تدبیر میں سے اس کے اُٹھنے کی صورتیں نکال دیتا ہے اور اُن لوگوں کے حصے میں رسوائی کے سوا کچھ نہیں آتا جنھوں نے اسے گرانا چاہا تھا اور اسی طرح اس کے برعکس خدا جسے گرانا چاہتا ہے اسے کوئی تدبیر سنبھال نہیں سکتی بلکہ سنبھالنے کی ساری تدبیریں اُلٹی پڑتی ہیں اور ایسی تدبیریں کرنے والوں کو منہ کی کھانی پڑتی ہے۔

اس حقیقتِ حال کو اگر کوئی سمجھ لے تو اسے پہلا سبق تو یہ ملے گا کہ انسان کو اپنے مقاصد اور اپنی تدابیر، دونوں میں اُن حدود سے تجاوز نہ کرنا چاہیے جو قانونِ الٰہی میں اس کے لیے مقرر کر دی گئی ہیں۔ کامیابی و ناکامی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن جو شخص پاک مقصد کے لیے سیدھی سیدھی جائز تدبیر کرے گا وہ اگر ناکام بھی ہوا تو بہر حال ذلت و رسوائی سے دو چار نہ ہوگا اور جو شخص ناپاک مقصد کے لیے ٹیڑھی تدبیریں کرے گا وہ آخرت میں تو یقیناً رسوا ہوگا ہی مگر دنیا میں بھی اس کے لیے رسوائی کا خطرہ کچھ کم نہیں ہے۔

دوسرا اہم سبق اس سے توکل علی اللہ اور تفویض الی اللہ کا ملتا ہے۔ جو لوگ حق اور صداقت کے لیے سعی کر رہے ہوں اور دنیا انھیں مٹا دینے پر تلی ہوئی ہو وہ اگر اِس حقیقت کو پیشِ نظر رکھیں تو انھیں اس سے غیر معمولی تسکین حاصل ہوگی اور مخالف طاقتوں کی بظاہر نہایت خوفناک تدبیروں کو دیکھ کر وہ قطعاً ہراساں نہ ہوں گے بلکہ نتائج کو اللہ پر چھوڑتے ہوئے اپنا اخلاقی فرض انجام دیے چلے جائیں گے۔

مگر سب سے بڑا سبق جو اس قصے سے ملتا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک مردِ مومن اگر حقیقی اسلامی سیرت رکھتا ہو اور حکمت سے بھی بہرہ یاب ہو، تو وہ محض اپنے اخلاق کے زور سے ایک پورے ملک کو فتح کر سکتا ہے۔ یوسف علیہ السلام کو دیکھیے، ۱۷ برس کی عمر، تن تنہا، بے سروسامان، اجنبی ملک اور پھر کمزوری کی انتہا یہ کہ غلام بنا کر بیچے گئے ہیں۔ تاریخ کے اُس دور میں غلاموں کی جو حیثیت تھی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس پر مزید یہ کہ ایک شدید اخلاقی جرم کا الزام لگا کر انھیں جیل بھیج دیا گیا۔ جس کی میعادِ سزا بھی کوئی نہ تھی۔ اس حالت تک گرا دیے جانے کے بعد وہ محض اپنے ایمان اور اخلاق کے بل پر اُٹھتے ہیں اور بالآخر پورے ملک کو مسخر کر لیتے ہیں۔

●●

(بقیہ ص ۲۴ کا)

اس کے برعکس حق کی راہ پہلے ہی قدم پر رُندھی ہوئی ہے۔ اگر آپ ہمت کر کے اس مزاحمت کو دُور کر لیں تو آگے کی راہ میں ہر قدم پر خطرہ ہے۔ یہاں تک کہ شروع سے لے کر آخر منزل تک خطرے کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔

ایسے نازک اور پُرآشوبِ زمانے میں یہ بات ذرا تعجب انگیز نہیں ہے کہ لوگ راہ سے بے راہ ہو گئے۔ تعجب انگیز اگر کوئی بات ہو سکتی ہے تو یہ ہو سکتی ہے کہ گمراہی کے اتنے سروسامان مہیا ہونے اور شیطان کے ایسے عالمگیر تسلط کے باوجود خدا کے کچھ بندوں کو اللہ کا نام یاد رہ گیا ہے۔ یہ بے چارے داد کے مستحق ہیں نہ کہ ملامت کے اور سینہ سے لگا لیے جانے کے لائق ہیں، نہ کہ کاٹ پھینکے جانے کے۔ جن لوگوں نے اتنے نامساعد حالات کے اندر اپنی شمعِ ایمان زندہ رکھی ہے، اگر ان کو موافق حالات میسر آتے تو وہ بہتر سے بہتر مسلمان ہوتے۔ اس وجہ سے ان کی غلطیوں اور غیر شعوری گمراہیوں یا اضطراری ضلالتوں کی بنا پر ان کو ایمان سے محروم قرار دے کر ان سے نفرت کرنے کے بجائے اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ ان میں ایمان و اسلام کے صحیح مقتضیات کا شعور بیدار رہو۔

●●

مولانا توفیق مصباحی پیلی بھیتی

معجزات اور سائنس

جدید مسلم ذہن کی تشکیک کے پیش نظر معجزات کے بارے میں معقول وممکن سائنسی توجیہہ وتشریح

جدید عقلیت نے کسی بھی چیز کے درست ہونے کا معیار یہ رکھا ہے کہ وہ انسانی عقل میں آجائے اور اس کا تجربہ بھی ممکن ہو۔ اس لاجک کے تحت مذہبی عقائد کو بھی ہدف تنقید بنایا گیا ہے چنانچہ جہاں عقیدۂ توحید، رسالت، آخرت پر عقلی سوالات اٹھائے گئے ہیں وہاں اس زد میں انبیا کے معجزات بھی آئے ہیں۔ جدید ذہن ان کی عقلی و سائنسی توجیہہ کا مطالبہ رکھتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ سائنس کچھ ڈائمنشنز، مشاہدات وتجربات تک محدود ہے، وہ ہر حتمی سچائی، راز اور علم سے واقف نہیں۔ پھر بھی کئی مسلم نوجوان ان عقائد کے بارے میں شکوک وشبہات کا شکار ہو گئے اور کچھ مخلص مسلمانوں نے جواب دینے میں ناکامی کی وجہ سے دین کی بنیادوں پر ہی انتہائی قسم کے سمجھوتے کر لیے۔ ہم عقائد کی سائنسی تفاسیر کے حق میں نہیں لیکن جدید مسلم ذہن کی اس تشکیک کو دیکھتے ہوئے ہم نے ارادہ کیا ہے کہ ان معاملات کی ایسی معقول وممکن سائنسی توجیہہ و تشریح پیش کر دی جائے جس سے ان کے خلاف عقل ہونے کے دعوی کی حقیقت واضح ہو جائے۔

معجزہ وہ خلاف عادت چیز ہے جو سوال اور دعویٰ (نبوت) کے بعد ظاہر ہو جو ہر حیثیت سے محال نہ ہو اور لوگ باوجود کوشش اور تدبیر کے اس قسم کے معاملات میں پوری فہیم وبصیرت رکھتے ہوئے بھی اس کے مقابلے سے عاجز ہوں۔ معجزے کے ذریعے چوں کہ ایسا واقعہ ظہور میں آتا ہے جو قوانین فطرت کی عام روش سے ہٹا ہوا ہوتا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ مدعی نبوت رب العالمین کا نمائندہ ہے جس نے اس کی صداقت ثابت کرنے کے لیے اپنی براہ راست مداخلت سے وہ واقعہ نشانی کے طور پر صادر کیا ہے۔ اگر چہ رسول کی سیرت، اخلاق، طبعی سلامت روی اور رسول کا سنایا ہوا پیغام خود سے دلیل ہوتا تھا لیکن ہر ذہن اس دلیل سے مطمئن نہیں ہوتا تھا اس لیے رسول کے ذریعے کوئی ایسا خرق عادت واقعہ پیش کیا جاتا جو کہ معلوم فطری قوانین کے مطابق ناممکن ہوتا۔ یہ خرق عادت واقعات خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے پیش نہیں کیے گئے بلکہ اصلاً رسول کو رسول ہونے کی دلیل کے طور پر اور ضمناً رسول کی تعلیمات کے حق ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کیے گئے۔

سائنس کے مزعومہ دریافت کردہ قوانین سے مرعوبیت کی بنا پر ہمارے یہاں ایسے مفسرین قرآن نے بھی جنم لیا جنھوں نے قرآن کو معلوم سائنسی قوانین کے مطابق ثابت کرنے کے جوش میں یا تو معجزات کا سرے سے انکار ہی کر دیا اور یا پھر ان کی ایسی بے سروپا تاویلات کیں کہ وہ معجزہ ہی نہ رہے۔ سائنسی معلومات و قوانین کی بنیاد پر معجزات کا انکار کرنے والے شخص کی ذہنی کیفیت اس ایلین کی سی ہے جو کہیں سے ہماری زمین پر آ گیا ہے اور ٹریفک سگنل کے سامنے کھڑا مشاہدہ کر رہا ہے۔ چنانچہ وہ مشاہدہ کرتا ہے کہ لال رنگ کی بتی جلنے پر گاڑیاں رک جاتی ہے اور سبز بتی پر چلنے لگتی ہے۔ فرض کریں متعدد دفعہ یہی مشاہدہ کرنے پر اس کے ذہن میں یہ مفروضہ جنم لیتا ہے کہ 'لال رنگ کی بتی گاڑی رکنے کا سبب ہے اور سبز رنگ کی بتی ان کی حرکت کا سبب'۔ اپنے مفروضے کی مزید تحقیق کے لیے وہ شہر بھر کے سگنلز کا چکر لگاتا ہے اور ہر جگہ واقعات کی اسی ترتیب کا مشاہدہ کرنے کے بعد وہ اپنے درج بالا مفروضے کو دنیا کا اٹل قانون مان لیتا ہے۔ اب فرض کریں سڑک پر اس کی ملاقات ہماری دنیا کے کسی شخص (آپ) سے ہوتی ہے اور وہ آپ کو دنیا کے بارے میں اپنے دریافت کردہ قانون سے آگاہ کرتا ہے یعنی' لال بتی ہمیشہ گاڑی روک دے گی اور سبز بتی اسے چلا دے گی'۔ آپ مسکرا کر اسے کہتے ہیں کہ جناب! لال اور سبز میں ایسا کچھ نہیں ہے جو گاڑیوں کو روکتا یا چلاتا ہے بلکہ ان رنگوں میں یہ معنی و تاثیر ہم انسانوں نے خود رکھے ہیں، جب تک ہم چاہتے ہیں یہ ترتیب نظر آتی رہتی ہے اور جب ہم نہیں چاہتے تو ہم اسے معطل

کر دیتے ہیں جیسے کہ ایمبولنس کو ہم نے اس قانون سے مستثنیٰ کر رکھا ہے، مگر وہ ایلین اپنی تحقیق پر بضدر ہتا ہے، آپ کی بات پر یقین نہیں کرتا بلکہ الٹا آپ کو جاہل اور نادان سمجھنے لگتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ 'دنیا کے قانون فطرت کے مطابق ہو ہی نہیں سکتا کہ ایمبولینس لال بتی پر نہ رکے۔'

یہی حالت ہر اس شخص کی ہے جو سائنسی مشاہدات کی بنیاد پر دریافت شدہ روابط کو حتمی سمجھتے ہوئے معجزات کا انکار کرتا ہے۔ خدا کا نبی کہتا ہے کہ یہ اشیا بذات خود موثر نہیں بلکہ ان کی یہ بظاہر دکھائی دینے والی تاثیر اور معنی حکم خداوندی کی بنا پر ہیں، جب تک وہ چاہتا ہے یہ ربط تمہیں دکھائی دیتا ہے اور جب اس کا اذن نہ ہو تو یہ روابط معطل ہو جاتے ہیں۔ مگر سائنس کا مارا ہوا نادان انسان خدا کی بنائی ہوئی دنیا کے بارے میں اپنے دریافت کردہ ربط کو اٹل جانتے ہوئے نبی کا تمسخر اڑاتا ہے۔

اب آیئے معجزے کو سائنسی طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب سے انسانوں کی ایک بڑی آبادی نے اس مادی دنیا کو سمجھنے پر زور دیا اور اس کو اپنے فوائد کے لیے استعمال کرنا شروع کیا تو مذاہب پر بہت سارے نئے اعتراضات کچھ زیادہ ہی خود اعتمادی لے کر حاضر ہوا۔ اس کے نتیجے میں کچھ مسلمانوں کو جوابات دینے میں کچھ زیادہ ہی دقتیں پیش آئیں اور کچھ مخلص مسلمانوں نے تو جواب دینے میں ناکامی کی وجہ سے دین کی بنیادوں پر ہی انتہائی قسم کے سمجھوتے کر لیے۔ اس کی اصل وجہ مسلمانوں کا ان جدید علوم کی حقیقت سے نابلد ہونا اور خود اعتمادی کی شدید کمی تھی جبکہ سائنسی علوم کو پیش کرنے والے اپنی علمیت پر بہت پر اعتماد تھے۔ اگر چہ بعد کے ادوار میں شکوک وشبہات کا بخوبی جواب دے دیا گیا لیکن ہمارا ایک طبقہ ابھی بھی شکوک وشبہات میں ہی جی رہا ہے۔

چونکہ باطل ایک ہی حالت میں نہیں رہتا، بھیس بدل بدل کر اور مختلف وسائل کو استعمال کر کے آتا ہے اور پرانے سوالات کو نئی نسل کے سامنے بالکل نئے انداز میں سوشل میڈیا کے ذریعے پیش کرتا ہے۔ ان میں ایک سوال یہ ہے کہ کیا معجزات کا صادر ہونا سائنس سے مطابقت رکھتا ہے؟ اس بارے میں پہلے تو معجزات و کرامات اور سائنس کی حقیقت کو پوری طرح سمجھنا ضروری ہے۔

کلام پاک میں انبیا کے معجزات کے جو واقعات پیش کیے گئے ہیں ان کو وسیع تر معنوں میں دو اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

اول یہ کہ جب رسول اپنی نبوت کا دعوی پیش کرتے تھے تو یہ ایک بہت بڑا دعوی ہوتا تھا۔ ایک انسان جب یہ دعوی کرے کہ میں رب العالمین کا نمائندہ ہوں اور اس کی طرف سے اس کے احکامات سنانے جا رہا ہوں تو یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ رسول کے اس دعوے کی دلیل کیا ہے۔ اس کے لیے اگر چہ رسول کی سیرت، اخلاق، طبعی سلامت روی اور رسول کا سنایا ہوا پیغام خود سے دلیل ہوتا تھا لیکن ہر ذہن اس دلیل سے مطمئن نہیں ہوتا تھا اس لیے رسول کے ذریعے کوئی ایسا خرق عادت واقعہ پیش کیا جاتا جو کہ معلوم فطری قوانین کے مطابق ناممکن ہوتا لیکن اس بات کا فیصلہ کہ ایسا کوئی خرق عادت واقعہ پیش کرنا ضروری ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ رب العالمین خود کرتا تھا اور اس واقعے کا اصل فاعل اللہ ہی ہوتا تھا مثلاً عیسیٰ، صالح اور موسیٰ علیہم السلام سے متعلق قرآن پاک میں ایسے واقعات کا ذکر ہے لیکن نوح، ہود، لوط علیہم السلام کے معاملے میں ایسے کسی واقعے کا ذکر نہیں ہے۔ اس ضمن میں ایک اور بات سمجھنے کی ہے کہ یہ خرق عادت واقعات خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے پیش نہیں کیے گئے بلکہ اصلاً رسول کو رسول ہونے کی دلیل کے طور پر اور ضمناً رسول کی تعلیمات کے حق ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کیے گئے۔ یہاں پر یہ واضح ہو کہ کسی نبی نے یہ دعوی نہیں کیا کہ وہ جب چاہے اپنی مرضی سے خرق عادت کام کر کے دکھا سکتا ہے۔

دوسری قسم کے معجزات وہ ہیں جو کہ اللہ کی طرف سے کسی نبی کی مدد و نصرت کے لیے پیش آئے۔ اس مدد میں نبی کو تعلیم دینا، نبی کے دل میں اطمینان وسکینت کا پیدا کرنا، نبی کو دشمنوں کی دشمنی سے بچانا یا نبی کی کسی خاص ضرورت کو خرق عادت طریقے سے پورا کرنا وغیرہ بھی شامل ہیں (مثلا واقعہ معراج، بدر و ثور میں نصرت)۔ اس قسم کا معجزہ بھی کسی انسان کی مرضی پر منحصر نہیں ہے کہ وہ جب چاہے اس کو پبلک مقامات پر یا لیبارٹری میں اس کا مظاہرہ کر کے دکھائے۔

کچھ معجزات ان دونوں قسموں پر محیط ہیں جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ کا ٹھنڈا ہونا۔

کرامات ان خرق عادت چیزوں کو کہا جاتا ہے جو کہ کسی غیر نبی

کے ذریعے سے پیش آئے۔ چونکہ کسی غیر نبی کے لیے پہلی قسم کی خرق عادت چیز کی ضرورت نہیں ہوتی اس لیے کرامات کی شکل میں صرف دوسری قسم باقی رہ جاتی ہے۔

جدید سائنس علیت کی ایک شاخ ہے جو کہ مشاہدات اور تجربات پر مبنی ہے۔کسی چیز کے سائنس ہونے کے لیے ضروری ہے کہ علم کی بنیاد مشاہدات اور تجربات پر ہو اور ان مشاہدات اور تجربات کا صرف ایک بار ہونا کافی نہیں ہے بلکہ بقدر ضرورت اس کو دہرانا بھی ضروری ہے اور مزید یہ کہ ان مشاہدات اور تجربات سے جو علمی نتائج اخذ کیے جاتے ہیں، اس کی بنیاد پر آگے کی پیشن گوئی بھی ممکن ہو۔علم و تحقیق میں سہولت کے لیے سائنس کچھ بنیادی اصول بھی طے کرتا ہے مثلاً یہ دعویٰ کہ مادہ اور قوت نہ پیدا کی جاسکتی ہے اور نہ ختم کی جاسکتی ہے۔ اس کائنات کے اندر جو بھی مادہ اور قوت ہے وہی چیز اپنی شکلیں تبدیل کرتی رہتی ہے۔سائنس کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ کائنات ایک بند نظام (Closed system) ہے۔ یعنی سائنس کا دعوی ہے کہ اس کائنات کے اندر جو بھی ہوتا ہے اس کی علت اسی کائنات کے اندر موجود ہے۔ واضح ہو کہ یہ دونوں نکات یعنی مادہ اور قوت کا کائنات کے اندر محدود ہونا اور کائنات کا ایک بند نظام ہونا، وہ بنیادی مفروضات ہیں جن پر سائنس کی پوری عمارت کھڑی ہے۔

سائنس کے یہ دونوں اصول سائنسی تحقیق کے لیے بہت بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔اگر سائنسی تحقیق کے لیے پہلے ہی سے یہ اصول نہ گھڑے ہوتے تو اتنی سائنسی ترقی ممکن نہ ہوتی۔ اگر انسان ہر واقعے کو کائنات سے باہر کی کسی باارادہ ہستی سے منسوب کرتا تو پھر وہ قواعد اور قوانین جن کے تحت کائنات چلتی ہے، کا دریافت کیا جانا انتہائی مشکل ہوتا۔ پھر انسان کسی قانون کی دریافت کے بجائے اس بیرونی قوت کے ارادے کو معلوم کرنے کی طرف متوجہ ہو جاتا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ سائنسی تحقیق میں تجربہ و مشاہدہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے اس لیے سائنس کا بہت بڑا حصہ استقرائی منطق پر مبنی ہے یعنی سائنسدان ایک نتیجے کو اخذ کرنے کے لیے مختلف تجربات کر کے اس کو دہراتے ہیں اور جب تمام تجربات اس نتیجے کی تائید کرتے ہیں تو اس نتیجے کی توثیق کر دیتے ہیں کہ ہمیشہ اس تجربے کا لازمی طور پر یہی نتیجہ نکلے گا۔

اس طرز تحقیق میں مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ محدود تجربے کو بنیاد بنا کر لامحدود نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔اس طرز تحقیق کے ساتھ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ایک نتیجے کی وجہ معلوم ہوئے بغیر صرف تجربے کی بنیاد پر اس نتیجے کو قبول کر لیا جاتا ہے مثلا جب نیوٹن نے یہ دیکھا کہ درخت سے سیب ہمیشہ نیچے گرتا ہے، اونچائی پر چڑھنے کے لیے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ سیارے سورج کے گرد گھومتے ہوئے اپنے مدار سے باہر نہیں نکل پاتے اگر چہ عام طور پر چیزیں خط مستقیم میں ہی سفر کرتی ہیں تو یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مادہ اپنی کمیت کے مطابق دوسرے مادے کو کھینچتا ہے۔ اس کھینچنے کی خصوصیت کو کشش ثقل کہتے ہیں اور اسی بنیاد پر ہم علم ریاضی کے فارمولے کو استعمال کرتے ہوئے کسی جسم کی حرکت کے بارے میں پہلے ہی سے بتا سکتے ہیں اس کی حرکت کیسی ہوگی لیکن اس تحقیق سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ مادہ کیوں دوسرے مادے کو کھینچتا ہے۔

بہت سارے معاملات ایسے ہیں جو کہ ہمارے شعور سے گہرا تعلق رکھتے ہیں لیکن ہم اوپر بیان کیے گئے سائنسی علوم کے دائرے میں اس کی تشریح نہیں کر پاتے مثلاً یہ سوال کہ کائنات ہمیشہ سے وجود رکھتی ہے یا کسی محدود وقت سے پہلے بنی، کائنات کا کوئی خالق ہے یا نہیں، انسانی شعور کی کیا حقیقت ہے؟ یہ ہمارے حیاتیاتی دماغ کا ہی حصہ ہے یا اس سے خارج میں کوئی چیز۔ اس طرح کے معاملے میں اپنی عقل کو استعمال کر کے غور وفکر کیا جاتا ہے اور استخراجی منطق کو استعمال کر کے نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ ہمارے مشاہدے اور تجربے کا بہت محدود ہونا ہے۔اس کو معقولات کہتے ہیں۔

علم فلسفہ کی ایک بنیادی بحث یہ ہے کہ علم کا منبع تجربات ہیں یا معقولات۔ ہم فی الحال اس بحث میں نہیں پڑتے، لیکن یہاں پر اس بات کی وضاحت کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ سائنسی علوم کی کچھ حدود ہیں۔سائنس فی نفسہ تمام علوم کا احاطہ نہیں کرتی۔

چونکہ سائنس اوپر بیان کردہ کچھ بنیادی مفروضات رکھتا ہے اس لیے ہم کبھی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ سائنسی دریافت سے جو علم حاصل ہوا وہ حتمی ہے۔

چونکہ سائنس محدود تجربات سے لاحدود نتائج اخذ کرتی ہے اس کی وجہ سے ہم کبھی نہیں کہہ سکتے کہ اگر حالات یا دیئے گئے پیرامیٹر میں کوئی جوہری تبدیلی آ گئی تو نتیجہ ہمارے علم کے مطابق ہی نکلے گا یا نہیں۔

چونکہ سائنس کسی نتیجے کی وجہ بتانے سے قاصر ہے اس لیے ہم کبھی نہیں کہہ سکتے کہ جو چیز سائنس کے نزدیک آج حتمی ہے تو وہ کل بھی حتمی ہی رہے گی۔ سائنس کسی ظاہرے کی وجہ بتاتی ہے تو پھر اس کے جواب میں ایک اور 'کیوں' چھپا ہوا ہوتا ہے۔ جب اس نئے کیوں کا جواب ملتا ہے تو اس کے پیچھے ایک اور کیوں ضرور ہوتا ہے۔

سائنس کی غیر یقینیت کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ نیوٹن نے اپنے تجربات کی بنا پر کشش ثقل (Newton's law of gravitation) دریافت کیا۔ اسی طرح نیوٹن نے حرکیات کے تین مشہور کلیے (Newton's laws of motion) دریافت کیے۔ جس کی وجہ سے نیوٹن کو دنیا کا سب سے عظیم تر سائنسدان مانا جاتا ہے لیکن جب ٹکنالوجی میں زیادہ ترقی ہونے کی وجہ سے درست ترین پیمائش کے نئے طریقے ایجاد ہوئے تو پتہ چلا کہ نیوٹن کے کلیات سے اخذ ہونے والے نتائج میں واضح طور پر غلطی موجود ہے جو کہ نئے پیمائش کے طریقوں سے دیکھی جاسکتی ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں آئن سٹاین نے دو نظریات پیش کیے جنہیں Special theory of relativity اور General theory of relativity کا نام دیا جاتا ہے۔ عام نظریہ اضافت یا General theory of relativity کے مطابق جہاں پر بھی مادہ ہوتا ہے وہاں پر خلا مادے کی طرف ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔ اس طرح ویسے تو ایک جسم body خلا میں سیدھ میں ہی جا رہا ہوتا ہے لیکن چونکہ خلا ہی ٹیڑھا ہو گیا ہے اس لیے وہ مادے کی طرف جھک جاتا ہے۔

اسی طرح حرکیاتی تحقیق کرتے ہوئے پتہ چلا کہ جب کوئی جسم body بہت زیادہ رفتار سے حرکت کرتی ہے تو نیوٹن کا دیا گیا فارمولا فیل ہو جاتا ہے۔ آئن اسٹائن نے تحقیق کر کے بتایا کہ body کی رفتار روشنی کی رفتار سے جتنی زیادہ قریب ہوگی، نیوٹن کے فارمولے میں اتنی زیادہ غلطی ہو جائے گی۔ اس کے حل کے لیے آئن سٹائن نے نئی تحقیق پیش کی جسے خاص نظریہ اضافت کہا جاتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق کسی جسم کی رفتار کی بنیاد پر فاصلہ اور وقت سکڑ کر چھوٹے ہو جاتے ہیں۔ اسی نظریے کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ وقت بھی خلا کا ایک بعد (Dimension) ہے یعنی جس طرح لمبائی چوڑائی اور اونچائی خلا کے ابعاد ہیں اسی طرح وقت بھی خلا کا ہی ایک حصہ ہے۔ اسی نظریے کا ایک دوسرا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ مادہ اور قوت ایک ہی چیز کی دو مختلف شکلیں ہیں۔ مادے کو قوت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور قوت کو مادے میں۔ اسی نظریے کو بنیاد بنا کر ایٹمی تحقیق کی گئی اور یورینیم نامی مادے کو جزوی طور پر قوت میں تبدیل کر دیا گیا۔ جس کو ایٹم بم اور نیوکلیر ریکٹر میں استعمال کیا جاتا ہے۔

ان دونوں نظریات نے سائنسی دنیا میں ایک بڑا انقلاب بر پا کر دیا جس کی وجہ سے انسان وجود، وقت، خلا اور مادے کو بالکل ہی دوسرے انداز میں دیکھنے کے قابل بن گیا۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ بھی جان لیں کہ آئن اسٹائن کے ہی دور میں نظریہ اضافت سے آگے بڑھ کر ایک تھیوری ایجاد ہوئی جسے کونٹم تھیوری Quantum Theory کہتے ہیں۔ اس نے مزید کچھ گتھیاں سلجھائیں تو مزید کچھ الجھنیں پیدا کیں۔ کوانٹم فزکس دراصل مادے اور قوت کے بنیادی ذرات سے متعلق نئی تحقیق تھی۔ اب تک سائنس کا نظریہ تھا کہ کائنات میں موجود ہر چیز ایک لگے بندھے قاعدے کے مطابق چلتی ہے اور اگر ہمیں ان قواعد کا علم ہو تو ہر ہر ذرے کی حرکت یا رویے کے بارے میں بالکل صحیح پیشن گوئی کی جاسکتی ہے لیکن کوانٹم فزکس نے ثابت کیا کہ انتہائی بنیادی ذرات کی سطح پر مادے کا رویہ بے ترتیب اور غیر متعین (Random) ہوتا ہے۔ ہاں ان ذرات کے مجموعی رویے یا حرکت کے اوسط کا تعین کیا جا سکتا ہے۔

آئن اسٹائن کے عام نظریہ اضافت اور قوانٹم تھیوری میں تناقض ہے اور اب تک اس تناقض کو دور کرنے کی راہ نہیں نکل سکی۔ اس تناقض کو دور کرنے کے لیے سائنسدانوں کی تجویز یہ ہے کہ خلا کے چار ابعاد (Dimensions) کو ماننے کے بجائے مزید ابعاد کو مانا جائے جن کا ادراک انسان کا شعور نہیں کر سکتا۔

اوپر بیان کردہ کشش ثقل کی مثال سے کچھ باتیں واضح ہوتی ہے۔

چیزوں کا نیچے گرنا عام مشاہدے کی چیز ہے جس سے ہر کوئی واقف ہے۔ جب اشیا اور قوانین فطرت کے بارے میں انسان متجسس ہوا تو اس وقت کی معلومات کے پیش نظر کشش ثقل کا نظریہ تیار ہوا اور تقریباً تین صدیوں تک اس کو قابل قبول سمجھا گیا لیکن جب نئی معلومات اور پیمائش کے آلے تیار ہوئے تو جو نظریہ تین صدیوں تک قابل قبول تھا، اس کی غلطی واضح ہوگئی۔ اس کے بعد نئے نظریے کی تدوین ہوئی جو کہ ریاضیاتی حساب سے تو بالکل صحیح ہے لیکن کوئنٹم فزکس کا نظریہ اس نظریہ کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ ان دونوں نظریات کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کے لیے یہ نظریہ پیش کا گیا کہ خلا کے چار سے زیادہ ابعاد (Dimensions) ہیں۔

اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں بالکل ہی صحیح ہیں کہ سائنس کی کوئی بھی تحقیق حتمی نہیں ہے۔ جب تک نئی دریافتیں اور نئی معلومات حاصل ہوتی رہیں گی، سائنس اپنے نظریات بدلتی رہے گی۔ ہم کبھی بھی اس پوزیشن میں نہیں ہوں گے کہ ہم یہ دعویٰ کرسکیں کہ سائنس نے کسی بھی قانون کی مکمل حقیقت دریافت کرلی۔

سائنس کی دریافتوں میں تضاد اور خلا موجود ہوتے ہیں اور سائنس دان ان تضادات میں مطابقت پیدا کرنے کی تگ و دو میں مصروف رہتے ہیں۔

چونکہ موجودہ دور کی محیر العقول دریافتوں کی نظیریں تاریخ انسانی میں نہیں ملتی اس لیے کچھ سائنس گرد اس سائنسی ترقی سے شدید متاثر ہوکر یہ نتیجہ اخذ کرلیتے ہیں کہ اس دور میں معقولات غیر ضروری چیز ہیں اور سائنسی طریقہ ہر قسم کی علمی ضرورت کو کفایت کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان محیر العقول دریافتوں کے باوجود یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ سائنس کی ہر نئی دریافت قانون فطرت کی ایک پرت کو کھول دیتی ہے اور اس کے نیچے ایک اور پرت ہوتی ہے جو اس بھی زیادہ دبیز ہوتی ہے۔ اس لیے انسانی علوم سے معقولات کو ختم کرکے سائنس کو معقولات کی جگہ دینا ایک بے کار کی کوشش ہے۔ سائنس نے چاہے جتنی ترقی کرلی ہو، ابھی معقولات کا متبادل بننے کا دعویٰ بہت جلد ہے اس لیے سائنس کا دائرہ اپنی حدود میں ہی رہے گا۔ ہاں اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ سائنسی ترقی نے ہمارے رہن سہن اور انداز فکر میں بہت زیادہ اثر ڈالا ہے لیکن یہ دعویٰ کہ سائنس کسی بھی چیز کی مکمل حقیقت معلوم کرسکتی ہے ایک بے بنیاد دعویٰ ہے۔ سائنس آگہی کا ایک آلہ (Tool) ہے جس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔

اب آتے ہیں معجزے کی سائنسی توجیہ پر۔ اس بارے میں دو ممکنہ مؤقف ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جو بھی معجزے ہوئے وہ قانون فطرت کے مطابق ہی ہوئے۔ لیکن چونکہ ہم ابھی قانون فطرت سے مکمل واقفیت نہیں رکھتے اور نہ ہی اس کا دعویٰ کرتے ہیں اس لیے ان معجزات اور معلوم قوانین فطرت کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ یہاں پر یہ واضح ہو کہ معجزات کے قوانین فطرت کے مطابق ہونے سے معجزے کی اصل حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑھتا۔ مثلاً اگر کوئی کل کو یہ ثابت کرے کہ موسیٰ علیہ السلام کے لیے دریا میں راستہ بنانے کی سائنسی توجیہہ ممکن ہے پھر بھی ان راستوں کے بننے اور موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قوم کے ساتھ عین اسی وقت دریا کے پاس پہونچنے کی ٹائمنگ کی توجیہہ صرف ارادہ خداوندی کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے۔ یہ حسن اتفاق بہرحال اخلاقی ہی ہے نہ کہ سائنسی۔

اس بارے میں دوسرا مؤقف یہ ہوسکتا ہے کہ اگرچہ اللہ کے حکم سے کائنات کا ذرہ ذرہ ایک لگے بندھے سائنسی قانون کے مطابق چل رہا ہے، اس کا قطعی مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ کی مخلوقات اللہ کے حکم سے ان قوانین سے انحراف نہیں کرسکتی۔ یہ ماننا کہ تمام مخلوقات قوانین فطرت کے مطابق ہی چلتی ہے اور اس سے انحراف نہیں کرتی، سائنس کا ایک مفروضہ ہے جس کے بغیر سائنس ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتی۔ لیکن یہ دعویٰ کہ یہ کلی و بدیہی حقیقت ہے ایک لغوترین دعویٰ ہے اس لیے معجزات کی سائنسی توجیہہ دینے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ جب سائنس یہ دعویٰ کرنے کے قابل ہو جائے کہ اس نے کائنات کی تمام حقیقتوں کو دریافت کے لیا تب سامنے آئے۔ ہم پھر بات کرلیتے ہیں۔

اوپر یہ واضح ہو چکا ہے کہ دونوں قسم کے معجزات میں صاحب معجزہ یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ جب چاہے اپنی مرضی سے معجزے دہرا سکتا ہے۔ اس لیے معجزے تجرباتی سائنس کے دائرے میں نہیں آتے۔ اس تناظر میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سائنس کی بنیاد

پر معجزے پر اعتراض کرنے والے بنیادی طور پر دو غلطیوں پر اصرار کرتے ہیں۔ اول یہ کہ وہ سائنسی دریافتوں کو حتمی سمجھتے ہیں اور دوم یہ کہ وہ تمام علوم کو نیچرل سائنس کے دائرے کے اندر سمجھتے ہیں۔

اوپر بیان کردہ پہلے مؤقف کو ماننے کی صورت میں یہ بات غیر ثابت شدہ ہوجاتی ہے کہ سائنس اور معجزے میں تناقض موجود ہے اور دوسرے مؤقف کو ماننے کی صورت میں اس بات کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ معجزے اور سائنس میں مطابقت پیدا کی جائے۔ کسی چیز میں اندرونی تضاد ہونا ایک علیحدہ بات ہے اور کسی چیز کا سائنس کے مطابق نہ ہونا ایک الگ بات۔

اس سطح پر جاکر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر معجزے کو دوبارہ تجربہ کر کے دہرایا نہ جائے تو پھر معجزے کے ماننے کے کیا معنی ہیں۔ اول تو یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ معجزے کو ماننا کوئی اسلام کی بنیادی دعوت نہیں ہے۔ جن لوگوں نے معجزے کا مشاہدہ کیا ان کے لیے معجزہ نبی کی نبوت کی دلیل ہے لیکن خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد ہم یہ دعوت نہیں دیتے کہ چونکہ نبی نے شق القمر کا معجزہ کیا ہے یا نبی نے معراج کا سفر کیا ہے اس لیے انہیں نبی مانا جائے۔ آج کے دور میں معجزے پر ایمان کی حیثیت ایک عقیدے کی بحث ہے نہ کہ نبوت کی دلیل۔ ہم معجزے کو اس لیے مانتے ہیں کیوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ فطری قوانین جن کی تگ و دو سائنس کرتا ہے وہ اللہ کے ہی بنائے ہوئے ہیں اور اللہ چاہے تو جب چاہیں انہیں تبدیل کر دے۔ یہاں پر واضح ہو کہ کچھ لوگ سائنسی قانون کو سنت اللہ قرار دے کر یہ دعوی کرتے ہیں کہ اللہ کی سنت کبھی تبدیل نہیں ہوسکتی۔ کلام پاک میں سنت اللہ کسی اور ہی چیز کو کہا گیا ہے اس لیے اس بارے میں کسی قسم کی الجھن کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ سنت اللہ وہی کچھ ہے جس کو اللہ اپنی سنت قرار دے۔

آج کے دور میں ہم اسلام کی دعوت قرآن کی بنیاد پر دیتے ہیں جو کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک زندہ معجزہ ہے اور آج بھی قابل مشاہدہ ہے۔ یہ قرآن انسان کی منطقی، جمالیاتی، اخلاقی اور کلامی حس سے اپیل کرتا ہے۔ جو لوگ ہدایت کے لیے حسی معجزات کا تقاضا کرتے ہیں تو دراصل ایمان بالغیب کا انکار کرتے ہیں۔ یعنی ان کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ جس چیز پر ایمان لانا ہے اس کے لیے معقول دلیل نہیں بالکل مشاہدہ ضروری ہے۔ قرآن کے بالکل ہی ابتدا میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ ہدایت کے لیے شرط ایمان بالغیب ہے۔ معجزے کے ذریعے مشاہدے کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ اس کے بعد مہلت ختم ہوجاتی ہے۔ اس لیے اللہ کی حکمت یہی رہی کہ اب انسان اپنے شعور، جمالیاتی اور اخلاقی حس کی بنیاد پر ایمان لے آئے۔

ہماری اس بحث سے کچھ نتائج واضح ہوجاتے ہیں:

(۱) فی زمانہ ہماری دعوت کی بنیاد حسی معجزات نہیں بلکہ انسانی شعور سے اپیل کی بنیاد پر ہے۔ آج کے دور میں معجزات کی حقیقت ایک عقیدے کے طور پر ہے نہ کی دعوت کی بنیاد کے طور پر۔ معجزے صرف وقتی طور پر غیب کے پردے کو ہٹانے کے لیے تھے۔ ہدایت کے لیے ایمان بالغیب ہی شرط ہے۔

(۲) کسی چیز کا مشاہدہ یا تجربہ نہ ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ چیز خلاف عقل ہے۔ علوم کی بہت ساری جہتیں صرف معقولات پر انحصار کرتی ہیں۔

(۳) سائنسی اعتبار سے یہ دعوی کرنا درست نہیں ہے کہ سائنس حقیقت کے تمام جوانب سے واقف ہوچکی ہے اس لیے معجزے کے صحیح ہونے کے لیے معلوم سائنسی اصولوں کے مطابق ہونا کوئی ضروری نہیں۔ موجودہ سائنسی علوم میں خود اس کے اندرونی تضادات موجود ہیں۔

(۴) سائنس انسانی علوم کی صرف ایک جہت ہے۔ انسانی علوم کے کچھ پہلو سائنس کے دائرے میں نہیں آتے۔ اس لیے معجزات کی سائنسی تشریح غیر ضروری ہے۔

(۵) اسلامی عقیدے کے مطابق معجزات اور کرامات کو کوئی انسان اپنی مرضی سے تجربہ کر کے اس کا مظاہرہ نہیں کرسکتا۔ اس لیے معجزے کو سائنسی تجربہ کر کے ثابت کرنے کوشش عبث ہے۔ جب دعوی ہی موجود نہیں تو ثبوت کی طلب بے معنی ہے۔

●●

عدم برداشت اور تعلیمات نبوی

ڈاکٹر مبشر حسن مصباحی

عدم برداشت کے حوالے سے مذہبی حلقے آج سب سے زیادہ عدم توازن کا شکار ہیں۔ دوسرے کے نقطۂ نظر کو سننے اور برداشت کرنے کی روایت ختم ہو چکی اور اپنے عقائد اور نظریات کو دوسروں پر نافذ کرنا ہر شخص اپنا مذہبی حق سمجھتا ہے

آج دنیا میں تحمل اور بردباری سے محرومی یعنی عدم برداشت انسانی معاشرے میں ایک خطرناک رخ اختیار کرتی چلی جارہی ہے۔ اس کی وجہ سے وحشت اور دہشت کے سائے سنگین ہوتے جارہے ہیں۔ ہیجان خیزی اور شورش پسندی کے باعث کہیں مذہب کو بنیاد بنا کر اور کہیں سیاسی گروہ بندی کے حوالے سے تشدد کا رجحان فروغ پارہا ہے۔ معمولی معمولی باتوں پر عزتیں لُٹ جاتی ہیں اور انسانی جانیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ بچوں کے معمولی جھگڑے خاندانوں کی بربادی کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں۔ مذہب سے بیگانگی اور دین سے دُوری کے سبب لوگ راہِ عمل کے بجائے راہِ فرار اختیار کررہے ہیں۔ اسی لیے اس متمدن دور میں بھی خودکشی کی شرح حیرت انگیز ہے۔ عدم برداشت اور تشدد پسندی کے حوالے سے مذہبی حلقے آج سب سے زیادہ عدم توازن کا شکار ہیں۔ دوسرے کے نقطۂ نظر کو سننے اور برداشت کرنے کی روایت ختم ہو چکی ہے۔ اپنے عقائد اور نظریات کو دوسروں پر نافذ کرنا ہر شخص اپنا مذہبی حق سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت فرد سے لے کر اقوام تک بے اطمینانی کا غلبہ ہے۔ باپ بیٹے اور بھائی بھائی کے درمیان کھینچا تانی ہے۔ ہر شخص انا و لاغیری کے گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے علاوہ کسی دوسرے کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ ان حالات میں لازم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات سے رہنمائی حاصل کی جائے جن میں تحمل، برداشت، حلم و بردباری، عفو و درگزر، رواداری و احترام کا درس ملتا ہے۔

عدم برداشت کا ایک اور اہم سبب معاشی اور معاشرتی ناہمواری ہے۔ امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتا چلا جارہا ہے۔ ایک کو سوکھی روٹی میسر نہیں اور دوسری طرف کتے بھی ڈبل روٹی اور دودھ پر پل رہے ہیں۔ محبت اور قناعت جیسے انسانی جذبے معاشرے سے مفقود ہو کر رہ گئے ہیں۔ اسی طرح سیاسی عدم توازن اور پسند و ناپسند نے بھی ہیجان خیزی اور تشدد پسندی کو فروغ دیا ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس نے بین الاقوامی سطح پر کمزور قوموں اور چھوٹے ممالک کی زندگی اجیرن کردی ہے۔

دنیا کے ان تمام مسائل کا حل اگر کہیں ہے تو صرف اور صرف تاجدار مدینہ صلی اللہ علیہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں جو کہ سراسر عدل اور محبت پر مبنی ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف ایک فرمان: لَاَ یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْهِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِهٖ (الجامع الصحیح: کتاب الایمان، لجنۃ احیاء کتب السنۃ، مصر، ج۱، ص ۲۸) ''تم میں کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے وہی چیز پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے کرتا ہے۔'' کو کوئی بھی معاشرہ حرزِ جان بنا لے تو وہ امن کا گہوارہ اور محبت کا گلستان بن جائے گا۔ اس لیے کہ ہر شخص اپنے لیے خوب صورت، اعلیٰ اور بہتر بات کو پسند کرتا ہے۔ ایمانی اور انسانی تقاضے کے مطابق جب وہ اپنے لیے پسند کی جانے والی اچھی چیز کو دوسروں کے لیے بھی مقدم بنائے گا تو اس سے ہر طرف امن اور محبت کی خوشبو پھیل جائے گی۔

اس وقت مسلمانانِ عالم اور اسلامیانِ ہند تاریخ کے ایک نازک دَور سے گزر رہے ہیں۔ عالم کفر اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ سیاسی، سماجی، معاشرتی، اقتصادی حتیٰ کہ نظریاتی اور اساسی پہلوؤں پر حملہ آور ہے۔ تحمل و برداشت اور حلم و بردباری ان اخلاقی صفات میں سے ہیں جو افراد کے لیے انفرادی طور پر اور اقوام کے لیے اجتماعی طور پر کامیابی، عزت و عظمت اور ترقی و بلندی کا ذریعہ بنتی ہیں۔ حلم کی وجہ سے انسان کے نفس میں وہ قوت برداشت اور وہ سکون و اطمینان پیدا ہوتا ہے کہ کسی حالت میں بھی قوت غضب غالب نہیں آتی۔ ایک حلیم انسان کی مرضی و منشا کے خلاف کوئی بات ہو یا اس کو کتنی ہی تکلیف پہنچائی جائے وہ صبر و ضبط سے کام لے کر انھیں برداشت کرتا ہے۔ قرآن مجید نے اس کی تاثیر یہ بیان کی ہے کہ دشمنی دوستی میں بدل جاتی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَلاَ تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلاَ السَّیِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ (حم السجدہ: آیت ۳۴) نیکی اور بدی یکساں نہیں۔ بدی کو اُس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔تم دیکھو گے کہ تمھارے ساتھ جس کی عداوت تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے برداشت وتحمل،حلم و بردباری اورحوصلہ وصبر اختیار کرنے کی نہ صرف تعلیم دی ہے بلکہ اپنے اسوۂ حسنہ کے ذریعے اس کی لازوال مثالیں قائم کی ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت کا ایک اہم راز یہ بھی ہے کہ مزاج مبارک میں برداشت وتحمل کی بے نظیر خصوصیت تھی۔لوگوں کی سخت کلامی،ان کے ناروا سلوک اور سخت ترین اذیت رسانی کے باوجود آپ ان پر خفا نہ ہوتے۔آپ کی یہی قوت برداشت اور متانت آپ کی صداقت کی بہت بڑی علامت ہے۔اسی علامت کو دیکھ کر اور آزما کر یہود کے ایک بہت بڑے عالم زید بن سعنہ آپ پر ایمان لائے اور اپنا آدھا مال صدقہ کر دیا اور پھر غزوۂ تبوک میں شہید ہو گئے۔ (سبل الھدی والرشاد فی سیرۃ خیر العباد: لجنۃ احیاء التراث الاسلامی،مطبوعہ قاہرہ، ۱۹۸۳ء، ج ۷،ص ۳۶)

قرآن مجید اسی طرف اشارہ کر رہا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ کُنْتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ لاَ نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِکَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ (آل عمران: آیت ۱۵۹) (اے پیغمبر!) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ آپ ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہیں ورنہ اگر کہیں آپ تندخو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب آپ کے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال برداشت، کمال حلم اور کمال عفو و درگزر کی تعریف فرمائی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی شاہد ہے کہ آپ نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی ذاتی معاملے میں انتقام نہیں لیا،سوائے اس کے کہ کسی نے احکام الٰہی کی خلاف ورزی کی ہو اور اللہ کی حدود میں سے کسی حد کو توڑا ہو۔ (الشفاء: مطبوعہ بیروت، ج ۱،ص ۱۴۰)

طائف والوں نے آپ کے ساتھ جو سلوک کیا وہ ناقابل فراموش تھا۔ سیدہ عائشہ صدیقہ ام المومنین نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: کیا احد کے دن سے زیادہ تکلیف دہ دن آپ پر گزرا ہے؟ فرمایا: تیری قوم نے یوم العقبہ کو جو تکلیفیں پہنچائیں وہ بہت زیادہ سخت تھیں (یعنی جس دن ثقیف کے سرداروں عبد یالیل وغیرہ کو دعوت دی اور انھوں نے جو سلوک میرے ساتھ روا رکھا وہ بڑا روح فرسا تھا)۔ (سبل الھدی والرشاد فی سیرۃ خیر العباد: لجنۃ احیاء التراث الاسلامی،مطبوعہ قاہرہ ۱۹۸۳ء، ج ۲،ص ۵۷۹)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مصائب و آلام اور حزن و الم سے بھرپور اس گھڑی میں بھی برداشت اور حوصلے کی وہ عظیم مثال قائم کی کہ شاید انسانی تاریخ ایسی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہو۔ پہاڑوں کے فرشتے نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سلام عرض کیا اور کہا: ’’اگر آپ فرمائیں تو پہاڑوں کو میں ان پر اوندھا گرا دوں اور اگر آپ چاہیں تو میں انھیں زمین میں غرق کر دوں‘‘۔ رحمت مجسم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی نسلوں میں ایسے لوگ پیدا فرمائے گا جو اللہ کی عبادت کریں گے اور کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ کریں گے۔

ہجرت کے نویں سال اسی طائف کی وادی کے سرداروں پر مشتمل ایک وفد بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوا۔شفقتوں اور محبتوں کے سائبان اس انداز میں تان دیے گئے کہ ان کے قیام کے لیے سب سے اعلیٰ اور ارفع مقام یعنی مسجد نبوی میں خیمے نصب کر دیے اور فیضان محبت والفت کی برکھا ان پر ہمہ وقت مہربان رہتی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ نجران کی بنی ہوئی چادر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لیے ہوئے تھے۔ایک بدو نے اس چادر کو اس زور سے کھینچا کہ گردن مبارک پر نشانات پڑ گئے۔ بدو کہنے لگا: ’’اللہ کا مال جو آپ کے پاس ہے اس سے مجھے بھی حصہ دیں‘‘۔ اس قبیح حرکت کو برداشت فرماتے ہوئے آپ مسکرا کر خادم کو حکم دیتے ہیں کہ اس کو مال غنیمت سے کچھ عطا کر دیں۔ (الامام اسماعیل بن عمر بن کثیر،السیرۃ النبویۃ، بیروت، دار الفکر، ۱۹۷۸ء، ج ۳،ص ۶۸۱)

اس کائنات میں یقیناً سب سے مشکل کام طاقت اور قوت رکھنے کے باوجود کسی زیادتی کو برداشت کر کے مسکرا دینا ہے۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے امتیازی اوصاف میں ایک بنیادی

وصف بے مثال اور لازوال قوت برداشت ہے۔ اعلان نبوت کے بعد مکّی اور مدنی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں کہ جس میں اسلام دشمنوں نے ہر ممکن طور پر اسلام، مسلمانوں اور پیغمبر اسلام پر ظلم و زیادتی میں کوئی کسر چھوڑی ہو لیکن آپ ہمیشہ قرآن پاک کی تعلیمات کا مظہر اتم و اکمل بن کر صبر و رضا کا مجسم پیکر بنے رہے۔ ہر زبانی اور جسمانی اذیت کا جواب عفو و درگزر اور صبر و استقامت سے دیا۔ قرآن پاک نے صبر یعنی برداشت کرنے کو تمام آزمائشوں کے لیے نسخۂ اکسیر قرار دیا ہے۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ (البقرہ: آیت ۱۵۵ - ۱۵۶) اور ہم ضرور تمھیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمھاری آزمایش کریں گے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے، تو کہیں کہ ”ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔“

اسی طرح ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے صبر کرنے والوں کو اپنی معیت کا یقین دلایا ہے۔ کتاب مبین میں ہے: اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (البقرہ: آیت ۱۵۳) ”بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“ مسلمانوں کو ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے صبر اور نماز سے مدد حاصل کرنے کا درس دیا گیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ... الخ (البقرہ: آیت ۴۵) ”صبر اور نماز سے مدد لو“ مسلم معاشرے میں امن و امان اور اخوت و بھائی چارے کے قیام کے لیے ایک دوسرے کو مسلسل حق اور صبر کی تلقین کرتے رہنے کا حکم دیا ہے: وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ لا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (العصر: آیت ۳) اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

برداشت اور صبر کی تعریف محققین نے یوں فرمائی ہے:

الصبر حبس النفس عند الالام والموذیات

یعنی تکلیف دہ اور پُر اذیت حالات میں بھی انسان اپنے آپ کو بے قابو نہ ہونے دے۔

مذکورہ بالا آیات قرآنی نظام حیات کے بارے میں مثبت انسانی اور اخلاقی رویوں کی تعمیر کے لیے ایک انتہائی اہم ضابطے کو بیان کرتی ہیں جس کا مفہوم اور حقیقت یہ ہے کہ کسی فرد یا قوم کی طرف سے ظلم و زیادتی کا ارتکاب کرنے کی صورت میں حتی الامکان عفو و درگزر، رواداری اور قوت برداشت کا مظاہرہ کیا جائے۔ یہ تعلیمات کسی قسم کی کمزوری کو ظاہر نہیں کرتیں بلکہ ان کا اصل مقصد قومی اور بین الاقوامی سطح پر امن کے قیام کے لیے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہے۔ کسی ایک فریق کی اشتعال انگیزی پر دوسرے فریق کا ویسا ہی ردِعمل نہ صرف امن و آشتی کے لیے زہر قاتل ہے بلکہ بسا اوقات ایسے رویوں کی بھاری قیمت چکانا پڑتی ہے۔

میدانِ جنگ ہو یا جنگی قیدیوں کی قسمتوں کا فیصلہ، گلے میں کپڑا ڈال کر کھینچنے والے بدو کا ہاتھ ہو یا راہوں میں کانٹے بچھانے کے اقدامات، ازواج مطہرات پر تہمتیں لگانے والے فتنہ پرداز ہوں یا عین جنگ کے موقع پر ساتھ چھوڑنے والے منافقین، نامناسب کلمات بولنے والی زبانیں ہوں یا معاہدوں کی خلاف ورزی کرنے والے فریق، انسان کامل اور معلم انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم ہر ہر مرحلے پر ایسی قوت برداشت کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ زیادتی کرنے والا شرمندہ ہو جاتا ہے اور بے اختیار دامن نبوت کی پناہ میں آ جاتا ہے۔ صبر و برداشت ایسا خوب صورت جذبہ ہے کہ جو انفرادی و اجتماعی سطح پر پروقار اور باعظمت مقام حاصل کرتا ہے اور اسی جذبے سے جانی دشمنوں کے دل جیتے جا سکتے ہیں۔ یہ جذبہ اگر انفرادی سطح پر ہو تو انسانی شخصیت کے گرد رعب و دبدبے کا عظیم حصار قائم کرتا ہے اور اگر قومی سطح پر ہو تو اقوام عالم میں ایسا تشخص عطا کرتا ہے جس کا تاثر پختہ اور دیرپا ہوتا ہے۔ ارشاد رب العزت ہے:

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَیِّئَةٌ یَّفْرَحُوْا بِهَا وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا یَضُرُّكُمْ كَیْدُهُمْ شَیْـًٔا اِنَّ اللّٰهَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ (ال عمران: آیت ۲۰) اگر تمھارا بھلا ہوتا ہے تو ان کو برا معلوم ہوتا ہے اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ خوش ہوتے ہیں مگر ان کی کوئی تدبیر تمھارے خلاف کارگر نہیں ہو سکتی بشرطیکہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔ جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اُس پر حاوی ہے۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ کو فتح کیا تو آپ ظالموں سے ایک ایک ظلم کا بدلہ لے سکتے تھے۔ اس کے باوجود رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے برداشت وتحمل کا وہ نمونہ پیش کیا جس کی مثال پوری تاریخ انسانی میں کہیں نہیں ملتی۔ آپ نے پیغمبرانہ جلال کے ساتھ سب کی طرف دیکھ کر فرمایا:

لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ یَغْفِرُ اللّٰہُ لَکُمْ وَھُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ اِذْھَبُوْا وَاَنْتُمُ الطُّلَقَآءُ آج میری طرف سے تم پر کوئی گرفت نہیں، اللہ تعالیٰ تمھارے سارے گناہوں کو معاف فرمائے اور وہ سب سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے۔ جاؤ، چلے جاؤ میری طرف سے تم آزاد ہو۔ (ابن قیم الجوزیہ، زاد المعاد فی ھدی خیر العباد، بیروت، موسسۃ الرسالۃ، ۱۹۸۵ء، ج ۳، ص ۴۴۲)

دشمنوں سے انتقام لینا انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور بالخصوص ان لوگوں سے جنھوں نے گھر چھین لیا ہو، زمین تنگ کر دی ہو، وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا ہو، پیاروں کا خون کیا ہو لیکن فتح یاب ہو کر برداشت، تحمل اور عفو و درگزر سے کام لے کر خون کے پیاسوں کو معافی کا سرٹیفکیٹ دے کر تاریخ عالم پر ''رحمت عالم'' کا نقش دوام ثبت فرما دیا۔ حضرت سعد بن عبادہ کی طرف سے جب یہ آواز آئی: الیوم یوم الملحمۃ ''آج کا دن قتل و غارت کا دن ہے'' تو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سعد نے غلط کہا ہے: الیوم یوم المرحمۃ ''آج کا دن رحمت کا دن ہے''۔ (سبل الھدی والرشاد فی سیرۃ خیر العباد: ج ۵، ص ۲۳۸)

دراصل شخصیت کا حسن اور کمال زبردست قوت برداشت اور تحمل و بردباری میں پنہاں ہے، مار دھاڑ، تخریب اور بربادی میں نہیں۔ برداشت و تحمل اور حلم و بردباری سے دل جیتے جاتے ہیں اور اس کے برعکس وقتی طور پر خوف و ہراس کی فضا قائم کر کے کام تو نکالا جا سکتا ہے لیکن انجام ایسے انقلابات کی شکل میں رونما ہوتا ہے جس کے نتیجے میں تباہی چارسو پھیل کر معاشرے کو غارت کر دیتی ہے اس لیے صحیح اور درست طریقہ وہی ہے جس کی قرآن و سنت نے تعلیم دی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کر کے دکھایا ہے۔ جیسا کہ حکم خداوندی ہے: وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (الشوریٰ: آیت ۴۳) البتہ جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے تو یہ بڑی اُولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے۔

ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے کچھ نصیحت فرمائیے۔ آپ نے فرمایا: غصہ نہ کیا کرو۔ اس شخص نے کہا: کچھ اور نصیحت فرمائیے۔ آپ نے پھر یہی فرمایا کہ غصہ نہ کیا کرو اور کئی بار یہی بات دہرائی۔ (مشکوٰۃ المصابیح، باب الغضب والکبر، منشورات، المکتب الاسلامی، دمشق، ج ۳، ص ۱۳۲)

برداشت و تحمل، عفو و درگزر اور رحمت و شفقت کی سب سے بڑی مثال وہ انقلاب ہے جو ۲۳ برس کے عرصے میں بپا ہوا جس کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدنی زندگی میں ۲۷ غزوات کیے اور غزوات و سرایا کی شکل میں کل ۸۲ جنگیں لڑی گئیں۔ انسان سوچتا ہے کہ اتنی زیادہ جنگوں میں خون خرابے اور تباہی و بربادی کا کیا حال ہوگا لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس اسلامی انقلاب میں فریقین کے کل انسان جو کام آئے ۹۱۸ ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس سے بڑا غیر خونی انقلاب آج تک دنیا میں کبھی بپا ہوا ہے جس کے ذریعے انسان کا ظاہر و باطن اور نظام معیشت و سیاست سب کچھ بدل جائے۔ ان کے مقابلے میں دوسرے انقلابات کا حال سب پر عیاں ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں مقتولین کی تعداد ۶۴ لاکھ اور دوسری جنگ عظیم میں یہ تعداد ساڑھے تین کروڑ سے زیادہ تھی لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انقلاب کی اساس نوع انسان کی خیرخواہی تھی۔ اس میں برداشت و تحمل اور عفو و درگزر کی روح رواں تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قافلہ آدمیت تحریک اسلامی کے دھارے پر بہتا چلا گیا اور دعوت حق کی کھیتی پھلتی پھولتی چلی گئی اور آہستہ آہستہ لوگ جوق در جوق انسانیت کے خیرخواہ اور برداشت و تحمل اور سلامتی والے دین اسلام میں داخل ہوتے چلے گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ تلوار سر کاٹتی ہے اور تحمل و برداشت دل جیتتا ہے۔ تلوار کی پہنچ گلے تک اور حلم و بردباری کی پہنچ دل کی گہرائی تک ہوتی ہے۔ جہاں تلوار نا کام ہوتی ہے وہاں عفو و درگزر فتح کا جھنڈا گاڑتا ہے۔ تیر و تلوار کی طاقت سے زمین تو چھینی جا سکتی ہے مگر کسی کا دل نہیں جیتا جا سکتا۔ دلوں کو ہاتھ میں لینے کے لیے ضرورت ہے محسن اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ کی۔

●●

انبیا کا طریقہ دعوت اور ہماری بے اعتدالی

محمد مستقیم علیمی ثقافی

جب گمراہیت کے ساز و سامان چاروں طرف بکھرے ہوئے ہوں تو لوگوں کی غیر شعوری گمراہیوں یا اضطراری ضلالتوں کی بنا پر ان کو ایمان سے محروم قرار دینے کے بجائے کوشش کرنی چاہیے کہ ان میں ایمان و اسلام کا صحیح شعور بیدار ہو

انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت ہوتی ہی اس زمانے میں ہے جب حق و باطل میں امتیاز، وحی الٰہی کی رہنمائی کے بغیر ناممکن ہوجاتا ہے اور عملاً تمام نظامِ زندگی، حق کی جگہ باطل کے قبضے میں آچکتا ہے۔ ایسے زمانے میں حق صرف نبی کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ اس کے دائرے سے باہر حق کے کچھ اجزا تو پائے جاسکتے ہیں لیکن پورے حق کا پایا جانا ناممکن ہے۔ اس وجہ سے اگر انبیائے کرام ابتدا ہی میں لوگوں کو اس طرح مخاطب کریں کہ ''اے کافرو! ایمان لاؤ، اے مشرکو! توحید اختیار کرو''، تو صورتِ واقعہ کے اعتبار سے ان کا یوں دعوت دینا بے جا نہیں ہوسکتا کیونکہ واقعہ یہی ہے کہ ان کے دائرے سے باہر جو کچھ ہے وہ صرف کفر و شرک ہی ہے۔

جن لوگوں نے حضرات انبیائے کرام کی تاریخ پڑھی ہے، وہ جانتے ہیں کہ وہ ایسا نہیں کرتے بلکہ وہ لوگوں کو ''اے انسانو! اے لوگو! اے میری قوم! اے اہل کتاب! اے وہ لوگو! جو یہودی ہوئے، اے وہ لوگو! جو نصرانی ہوئے، اے وہ لوگو! جو ایمان لائے'' وغیرہ خطابات سے مخاطب کرتے ہیں اور ان کا یہی طرزِ خطاب اس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک قوم ان کو اپنی ضد اور ہٹ دھرمی اور حق دشمنی سے اس قدر مایوس نہ کردے کہ ان کے لیے قوم سے علیحدگی اور ہجرت کا وقت آجائے۔ جب قوم اپنی حق دشمنی میں اس حد تک آگے بڑھ جاتی ہے کہ اہل حق کا وجود اپنے اندر کسی طرح گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی اور تائیدِ حق کی بڑی سے بڑی دلیل بھی اس کی ضد کے آگے بیکار ہو کے رہ جاتی ہے۔ اس وقت انبیائے کرام اپنی قوم کو چھوڑتے ہیں اور یہی وقت ہوتا ہے کہ وہ صاف صاف الفاظ میں ان لوگوں کے لیے کافر و مشرک وغیرہ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو اپنے کفر و شرک پر اَڑے رہتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اُسوہ:

یوں تو یہ حقیقت ہر نبی کی دعوت میں واضح ہے، لیکن خصوصیت کے ساتھ حضرت ابراہیم اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مختلف مدارج پر جس شخص کی نظر ہوگی، وہ اس حقیقت کا کسی طرح انکار نہیں کرسکتا۔ حضرت ابراہیم نے اپنے باپ کو، اپنی قوم کو اور اپنے عہد کے بادشاہ کو، جن الفاظ سے خطاب کیا ہے، ان میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ وہ مخاطب کو ایک کافر و مشرک کی حیثیت سے مخاطب کر رہے ہیں، لیکن جب دعوت و تبلیغ پر ایک مدت گزر گئی اور دلائل و معجزات کی ساری قوت قوم کی ضد کے مقابل میں نہ صرف بے اثر رہی بلکہ یہ ضد اس قدر بڑھ گئی کہ پوری قوم ان کی جان کے دَر پے ہوگئی۔ اس وقت انھوں نے قوم سے علیحدگی کا اعلان کیا اور ایسے الفاظ میں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قوم کے کفر و شرک کے ساتھ رواداری کی جو آخری حد تک ہوسکتی تھی وہ اب ختم ہوچکی ہے، اور اب نہ صرف یہ کہ وہ ان کے کفر و شرک کا اعلان کرنا چاہتے ہیں بلکہ قوم کے ساتھ اس وقت تک کے لیے اپنی نفرت و عداوت کا بھی اعلان کرنا چاہتے ہیں، جب تک وہ توحید پر ایمان نہ لائے:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاۗءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ (الممتحنۃ: آیت ۴)

تمھارے لیے بہترین نمونہ تو ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں ہے، جب کہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور ان سے، جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، بالکل بَری ہیں۔ ہم نے تمھارا انکار کیا اور ہمارے اور تمھارے مابین ہمیشہ کے لیے دشمنی اور بیزاری آشکارا ہوگئی یہاں تک کہ تم اللہ پر ایمان لاؤ۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوہ:

ٹھیک یہی حال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا ہے۔ قربِ ہجرت سے پہلے کی کسی سورۃ میں بھی یہ بات نہیں مل سکتی کہ حضور اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کو یا اہلِ کتاب کو صریح طور پر کافر و مشرک یا منافق وغیرہ کے الفاظ سے مخاطب کیا ہو۔ بالکل ابتدائی سورتوں میں زیادہ تر خطاب یا تو یَآیُّھَا الْاِنْسَانُ کے الفاظ سے یَآیُّھَا النَّاسُ یا، یَقُوْمِ کے الفاظ ہیں۔اسی طرح اہل کتاب کے لیے یَآاَھْلَ الْکِتَابِ کے یا اس کے ہم معنی الفاظ ہیں۔ یہاں تک کہ منافقین کے لیے بھی فتح مکہ کے بعد تک وہی عام لفظ یَآیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کا استعمال ہوتا رہا اور صراحت کے ساتھ ان کو 'اے منافقو' کے الفاظ سے کہیں خطاب نہیں کیا گیا۔

لیکن جب ایک مدت کی دعوت وتبلیغ کے بعد قوم پر اللہ کی حجت پوری ہوگئی اور نہ ماننے والوں نے نہ صرف یہ کہ مانا نہیں بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کرلیا۔اس وقت آپ نے ہجرت فرمائی اور کفّارِ قریش کو صاف صاف 'اے کافرو' کے الفاظ سے مخاطب کیا گیا اور ان سے اور ان کے دین سے اپنی علیحدگی کا اعلان کیا۔اسی ہجرت کے موقعے پر یہ سورۃ نازل ہوئی جو قریش سے اعلانِ براءت بلکہ اعلانِ جنگ کی سورۃ ہے:

قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَ لَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ وَ لَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ وَ لَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ (الکافرون: آیت ۱-۶) تم فرماؤ اے کافرو! نہ میں پوجتا ہوں جو تم پوجتے ہو، اور نہ تم پوجتے ہو جو میں پوجتا ہوں، اور نہ میں پوجوں گا جو تم نے پوجا، اور نہ تم پوجو گے جو میں پوجتا ہوں۔تمہیں تمہارا دین اور مجھے میرا دین۔

کافر اور مرتکبِ کفر میں فرق:

انبیائے کرام علیہم السلام یہ ساری احتیاط صرف اس حد تک برتتے ہیں۔ جہاں تک لوگوں کو کافر ومشرک قرار دینے کا معاملہ ہے، ان کے کافرانہ اور مشرکانہ اعمال کو کفروشرک قرار دینے میں انبیائے کرام کبھی کوئی رعایت نہیں فرماتے۔اس چیز میں اگر کسی وجہ سے وہ کوئی رعایت کرنا بھی چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو اجازت نہیں دی جاتی اور سخت سے سخت مخالف حالات کے اندر بھی ان کو یہی ہدایت کی جاتی ہے کہ کسی بات کو کفروشرک قرار دینے میں نہ وہ کسی خطرے کی پروا کریں اور نہ کسی مصلحت کا لحاظ کریں۔اس کا سبب العیاذ باللہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ لوگوں کو کافر ومشرک قرار دینا چاہتے ہیں لیکن محض فتنے کے اندیشے یا اس خیال سے کہ لوگ دعوت سے بدک جائیں گے، ایسا کرنے سے احتراز کریں۔

اس طرح کی مصلحت پرستی ان کے یہاں جائز ہوتی تو کفّار جس طرح کے سمجھوتے کی تجویز پیش کیا کرتے تھے، وہ بڑی آسانی سے ان کو منظور کر کے سارا جھگڑا ختم کر سکتے تھے لیکن معلوم ہے کہ کسی پیغمبر علیہ السلام نے بھی دین کے بارے میں کبھی اس طرح کی مصلحت کا لحاظ نہیں کیا، خواہ اس کی وجہ سے اس کو کتنے ہی بڑے بڑے خطرات کا مقابلہ کیوں نہ کرنا پڑا ہو۔اس وجہ سے یہ سوال قابلِ غور ہے کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ کفروشرک کو کفروشرک قرار دینے کے معاملے میں جو لوگ اتنے بے پروا اور اتنے بے خوف تھے، انھوں نے کفروشرک کے مرتکبین کو کافر ومشرک قرار دینے میں اتنی احتیاط کی اور ان سے براءت اور علیحدگی کے اعلان میں اتنی دیر لگائی؟

ہمارے فہم ناقص میں انبیائے کرام علیہم السلام، کفروشرک کو کفروشرک قرار دینے کے باوجود ان کے مرتکبین کو کفروشرک قرار دینے اور ان سے اعلانِ براءت میں جو دیر لگاتے ہیں، اس کی دو نہایت اہم وجہیں ہیں:

پہلی وجہ: پہلی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بندوں کو جو کچھ سرزنش وملامت ہے، وہ اتمامِ حجت اور تبلیغِ کامل کے بعد ہے۔اگر اتمامِ حجت اور تبلیغ کے بغیر لوگوں پر گرفت یا ان سے اظہارِ بیزاری جائز ہوتا تو اللہ تعالیٰ انبیائے علیہم السلام کو مبعوث ہی نہ فرماتا۔اس وجہ سے یہ ضروری ہوا کہ انبیائے کرام لوگوں کو کافر قرار دینے اور ان سے اعلانِ براءت کرنے سے پہلے ان کو اتنا موقع دیں کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہوجائے اور ان کے انکار کے لیے ضد اور ہٹ دھرمی کے سوا کوئی اور وجہ باقی نہ رہ جائے۔یہ کام ایک مدت کی تبلیغ و تعلیم کا محتاج ہے۔انبیا کے وقفے کے زمانے میں جو تاریکی چھا جایا کرتی ہے، وہ اتنی سخت ہوتی ہے کہ اس کے اندر خواص کو بھی راہِ حق سُجھائی نہیں دیتی، چہ جائیکہ عوام کالانعام۔اس وجہ سے ہر گروہ تعلیم و تبلیغ کا محتاج ہوجاتا ہے۔چونکہ تمام گمراہیاں باپ دادا کی روایات بن کر دلوں میں رچ بس جاتی ہیں اور ان کے ساتھ کچھ لوگوں کے اغراض بھی وابستہ ہوجاتے ہیں اس وجہ سے اس بات کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ ان کے مٹانے کے لیے ایک مدت تک جہاد کیا جائے۔

حضرات انبیائے کرام پورے صبر واستقلال کے ساتھ ایک لمبی مدت تک اس جہاد میں سرگرم رہتے یہاں تک کہ حق اس قدر واضح ہوجاتا کہ ان لوگوں کے سوا جن کے باطل کے ساتھ اغراض وابستہ ہوتے تھے، کوئی اس سے انکار نہیں کرسکتا۔ جب تبلیغ کا حق اس حد تک پورا ہوچکتا، تب انبیا کے لیے یہ بات جائز ہوتی ہے کہ وہ منکرین کے کفر وشرک کا اعلان کر کے ان سے علیحدہ ہوجائیں۔

دوسری وجہ: دوسری وجہ یہ ہے کہ جب پوری سوسائٹی کا نظام حق کی جگہ باطل کی بنیاد ہی پر قائم ہوکر چلنے لگ جاتا ہے تو اُن لوگوں کے لیے بھی حق کی پیروی ناممکن ہوجاتی ہے جو حق کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت زندگی کے ہر گوشے میں فساد اس طرح گھس جاتا ہے کہ کسی محتاط سے محتاط آدمی کے لیے بھی یہ ممکن نہیں رہ جاتا کہ وہ فساد کے کچھ جراثیم نگلے بغیر سانس لے سکے۔ ایسی صورت میں اگر اس مجبوری کا لحاظ کیے بغیر انبیائے کرام لوگوں پر کفر وشرک کے فتوے جڑ کر ان سے براءت کا اعلان کردیتے تو یہ بہتوں پر نہایت شدید ظلم ہوتا۔ اس وجہ سے وہ تکفیر اور اعلانِ براءت سے اپنا کام شروع کرنے کے بجائے اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ ان کی تبلیغ و دعوت سے ایسا ماحول پیدا ہو کہ اس کے اندر اہل حق اپنے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔

یہ ماحول جب پیدا ہونے لگتا اور زندگی کی وہ راہ کھل جاتی جس پر حق پرست چل سکتے ہوں، اگرچہ یہ راہ ابھی تنگ اور دشوار گزار ہی ہو۔ تب وقت آتا ہے کہ جو لوگ اس کو چھوڑ کر محض اپنی تن پروری اور جھوٹی نمایشوں کی خاطر باطل کی راہ پر بھاگے چلے جارہے ہیں، ان کے کفر کا بھی اعلان کردیا جائے اور ان سے علیحدگی بھی اختیار کرلی جائے۔

موجودہ حالات میں طریقۂ کار:

حضرات انبیائے کرام کے اس اسوۂ حسنہ سے اگر ہم موجودہ حالات میں رہنمائی حاصل کریں تو یہ امر بالکل واضح ہے کہ اس پوری دُنیا میں جو حالات ہیں وہ بہت سے اعتبارات سے انبیا کے وقفے کے زمانے سے مشابہ ہیں۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب آج بے کم و کاست ہمارے اندر موجود ہے۔ اس وجہ سے اس وقت دُنیا کسی نبی کی ہدایت کی محتاج نہیں ہے اور نہ اب قیامت تک کسی نبی کی محتاج ہوگی لیکن خلق کی رہنمائی اور مسلمانوں کو حق پر استوار رکھنے کے لیے ہمارا شرعی نظام، خلافت کا نظام تھا، جو ایک مدت سے درہم برہم ہوچکا ہے۔ اس وجہ سے اس وقت دُنیا جن خرابیوں اور گمراہیوں میں مبتلا ہوچکی ہے اس کے لیے وہ ایک بڑی حد تک معذور ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک کے لیے اب دُنیا پر اتمامِ حجت کا فرض اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر ڈالا ہے اور اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ ہی کی بتائی ہوئی صورت یہ ہے کہ مسلمان خلافت کا نظام قائم کریں، جو ایک طرف دُنیا کو نیکی اور بھلائی کے راستہ کی دعوت دے اور دوسری طرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعے سے مسلمانوں کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھے۔ خلافت کا نظام قائم نہ رہنے کی وجہ سے ان دونوں باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی پوری نہیں ہورہی ہے بلکہ عملاً ساری دُنیا ایک باطل نظام کی گرفت میں آچکی ہے اور باطل ایسی قوت وشوکت کے ساتھ زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے کہ حق کے لیے موجودہ نظامِ زندگی میں کوئی جگہ سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی ہے۔

نظامِ تعلیم، نظامِ تمدن، نظامِ معاشرت، نظامِ سیاست ہر چیز حق سے منحرف اور باطل کی مددگار ہے، یہاں تک کہ اس کے زیر سایہ اگر کوئی چھوٹا بڑا کام دین کے نام سے انجام دیا بھی جارہا ہے تو وہ بھی اس وقت کی فضا کی ناسازگاری کی وجہ سے باطل ہی کو تقویت پہنچارہا ہے۔ نیک سے نیک انسان جو فی الحقیقت نیکی اور سچائی کے راستے ہی پر چلنا چاہتا ہے، آج چند قدم بھی بغیر مزاحمت کے حق کے راستے پر نہیں چل سکتا۔ اگر دُور والے اسے تھوڑی دیر کے لیے بخش دیتے ہیں تو قریب والے ہی اس سے اُلجھتے ہیں اور کسی طرح نہیں چاہتے کہ وہ اپنی منتخب کی ہوئی راہ میں دو قدم بھی آگے بڑھ سکے۔

حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا کہ ''بدی کی راہ فراخ ہے اور اس پر چلنے والے بہت ہیں، نیکی کی راہ تنگ ہے اور اس کے چلنے والے تھوڑے ہیں''۔ یہ چیز آج آنکھوں سے مشاہدہ کی جاسکتی ہے۔ باطل کی منزل پر پہنچنے کے لیے فراخ سڑکیں ہیں، دو رویہ درختوں کا سایہ ہے، تیز رو سواریاں ہیں۔ حفاظت کے لیے بدرقہ ہے، ہر منزل پر عیش وآرام ہے۔ آپ جس وقت چاہیں آرام سے منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔............(بقیہ ص ۱۱ پر)

●●

مولانا عارف رضا نعمانی

حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ

وہ صحابی رسول جو انصار میں سب سے پہلے اسلام لائے، انہی کی وجہ سے انصار مدینہ اسلام کی طرف آئے اور انہیں ہجرت سے قبل مدینہ منورہ میں جمعہ قائم کرنے کا شرف حاصل ہوا

نام ونسب:

حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کی کنیت ابو امامہ تھی جس سے وہ زیادہ مشہور تھے۔ والدہ کا نام سعاد الضریعہ تھا۔ وہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ (رئیس انصار) کے خالہ زاد بھائی تھے۔ ان کا تعلق قبیلہ خزرج کی شاخ بنونجار سے تھا جن سے ہمارے آقا ومولا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ننھالی رشتہ بنتا ہے۔ آپ اسعد کے لقب سے مشہور تھے گویا آغاز سے ہی سعادت مند طبیعت پائی تھی۔ سچائی سے فطری لگاؤ تھا۔ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ طبعاً موحد تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد آپ نے عمارہ بن حزم اور عوف بن عفرا کے ساتھ بنونجار کے بتوں کے خلاف جہاد کی توفیق پائی۔ (طبقات ابن سعد: ج ۳، ص ۶۰۸، ۶۱۰)

قبول اسلام:

حضرت اسعد بن زرارہ کے قبول اسلام کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ اس زمانے میں مدینہ کے مختلف قبائل میں باہم آویزش تھی۔ جنگ کی تیاری ہو رہی تھی۔ اسعد اپنے ساتھی ذکوان کے ساتھ مکہ میں اپنے ایک سردار دوست عتبہ بن ربیعہ کے یہاں امداد کے طالب ہو کر گئے، وہیں انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت کی تفصیل کا علم ہوا۔

چنانچہ پھر وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان کو اسلام کا پیغام سمجھایا۔ قرآن شریف کی تلاوت سنائی۔ وہ طبعاً پہلے ہی توحید کی طرف راغب تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مؤثر دعوت الی اللہ سے اسلام ان کے دل میں گھر کر گیا۔ وہ اسلام قبول کر کے واپس مدینہ لوٹے۔ روایات میں ہے کہ مدینہ میں انہوں نے خاموشی سے اسلام کا پیغام پہنچانا شروع کیا۔ اسی کے نتیجے میں ۶ر افراد پر مشتمل ایک ابتدائی وفد نے حج کے موقع پر ان کے ساتھ پہلی دفعہ مقام عقبہ پر آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی۔ حضرت اسعد بیعت عقبہ ثانیہ میں بھی شامل تھے اور بنونجار کے نقیب (سردار) کے طور پر ان کو خدمت کی سعادت ملی۔ مؤرخ ابن اسحاق نے عقبہ اولیٰ اور عقبہ ثانیہ کی دونوں بیعتوں میں حضرت اسعد بن زرارہ کے شامل ہونے کا ذکر کیا ہے۔ گو اس زمانے میں ان کی عمر کم تھی لیکن سردارانہ فہم وفراست اللہ تعالیٰ نے بہت عطا کی تھی۔ (اسد الغابہ: ج ۱، ص ۷۱)

بیعت کی حقیقت:

بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر ان کی دانش اور سنجیدگی کا اظہار حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے بیان کے مطابق اس طرح ہوا کہ بیعت کے وقت حضرت اسعد بن زرارہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ

''اے لوگو! جانتے ہو کہ کس بات پر تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کر رہے ہو۔؟ اس کی حقیقت سمجھ کر بیعت کرنا، یہ بیعت اس بات پر ہے کہ تمہیں سارے عرب کے ساتھ جنگ مول لینی پڑے گی، تمام عجم کے ساتھ تمہاری لڑائی ہوگی اور تمام جن وانس کے ساتھ برسرِ پیکار ہو جاؤ گے۔''

حاضرین نے بھی کیا خوب جواب دیا:

''ہاں اس شعور کے ساتھ ہم بیعت کر رہے ہیں کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کرے گا ہم اس سے جنگ کریں گے اور جو آپ سے صلح کرے گا ہم اس سے صلح کریں گے۔''

پھر بھی حضرت اسعد بن زرارہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ نہیں چھوڑا بلکہ عرض کیا: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) اس وقت بیعت کے موقع پر آپ جو شرط چاہیں عائد کر دیں، میں اس شرط پر آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً فرمایا: ''تم سب اس بات پر میری بیعت کر رہے ہو کہ یہ گواہی دو گے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور تمہیں سننا اور اطاعت کرنا ہوگی اور باہم اختلاف پیدا نہیں کرنا

اورتمہیں میری حفاظت کرنی ہوگی، بالکل اسی طرح جس طرح اپنی جانوں اوراپنے گھروالوں کی حفاظت کرتے ہو۔"

اس پر تمام لوگوں نے یہ عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہم بلاشبہ اسی طرح آپ کی حفاظت کریں گے۔ یہی حضرت اسعد کا مقصد تھا کہ بیعت کی حقیقت سب پر کھل جائے۔ اس پر مجمع میں سے آواز آئی کہ "اگر یہ سب کچھ ہم نے کیا تو ہمیں کیا ملے گا؟" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جنت ملے گی اور اس دُنیا میں خدا تعالیٰ کی تائید و نصرت سے بھی ہمکنار رہو گے۔" دوسری روایت میں ہے کہ حضرت اسعد بن زرارہ نے (جو عمر میں سب انصار سے چھوٹے تھے) کہا: "اے اہل یثرب! ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صرف اس لیے آئے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول ہیں اور ہمیں خوب علم ہے کہ آج آپ کی بیعت کے نتیجے میں سارے عرب سے دشمنی مول لینا اور اپنے پیاروں کو قتل کروانا ہے۔ پس اگر تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبول کرتے ہو تو اس کا اجر تم کو اللہ تعالیٰ دے گا اور اگر اپنی جانوں کا خوف ہے تو ان کو چھوڑ دو۔" انہوں نے کہا: "اے اسعد! ہم ان کی بیعت کبھی نہ چھوڑیں گے، نہ اس میں خیانت کریں گے۔" پھر سب نے باری باری بیعت کی۔ (طبقات ابن سعد: ج ۳،ص ۳۲۲)

مدینے میں پہلا جمعہ:

حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے فضائل کا ذکر احادیث میں ملتا ہے کہ وہ سبقت جو ان کے حصے میں آئی، اس میں ایک نماز جمعہ کا آغاز ہے۔ چنانچہ سب سے پہلا جمعہ جو مدینے میں پڑھا گیا، اس کا انتظام و انصرام کرنے والے حضرت اسعد بن زرارہ ہی تھے۔ انہوں نے ہی نماز جمعہ کی بنا وہاں پر ڈالی تھی۔ مدینہ منورہ میں ایک بڑی حویلی یا دالان دو یتیم بچوں سہل اور سہیل کی ملکیت تھا، وہ دونوں حضرت اسعد بن زرارہ کی کفالت میں تھے۔ اس جگہ حضرت اسعد نے جمعہ کا انتظام کیا جس میں چالیس کے قریب لوگ شامل ہوئے۔ یہ بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد کا واقعہ ہے۔ (اسد الغابہ: ج ۱،ص ۷۱)

روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس موقع پر مسلمانوں کے پہلے اجتماع کی خوشی میں حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے ایک بکری بھی ذبح کروائی اور جمعہ میں شریک مسلمانوں کی دعوت کا انتظام کیا۔ حضرت اسعد بن زرارہ اس وقت تک نماز جمعہ پڑھاتے رہے۔ یہاں تک کہ اسلام کے پہلے مبلغ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مدینہ تشریف لائے۔ اس کے بعد امامت اور دیگر ذمہ داریاں انہوں نے سنبھال لیں۔ پھر جب وہ اگلے سال بعض انصار کا وفد لے کر نبی رحمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف ملاقات کے لیے مکہ گئے تو اس دوران بھی حضرت اسعد بن زرارہ ہی کو مدینے میں جمعہ پڑھانے کی سعادت نصیب ہوتی رہی۔ (طبقات ابن سعد: ج ۳،ص ۶۰۹)

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ (شاعر دربار نبوی) جب جمعہ کے لیے نکلتے تو اذان کی آواز سن کر مسنون دُعائیہ کلمات کے بعد استغفار پڑھتے اور خاص طور پر حضرت اسعد بن زرارہ کے لیے مغفرت کی دُعا کیا کرتے۔ کسی کہنے والے نے انہیں کہا کہ "یہ کیا بات ہے کہ جمعہ کی اذان کے وقت آپ خاص طور پر اسعد بن زرارہ کے لیے بخشش کی دُعا کرتے ہیں۔؟" انہوں نے کہا: "اسعد وہ شخص تھا جس نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینے میں تشریف آوری سے پہلے مدینے میں جمعہ کا آغاز کیا تھا۔" (اصابہ: ج ۱،ص ۳۲)

خدمتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم:

پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینے تشریف لے آئے تو انصار مدینہ نے بیعت عقبہ میں جو عہد کیے تھے اس کے مطابق اپنا سب کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام کے لیے ہر صحابی اپنا گھر پیش کر رہا تھا۔ حضور نے فرمایا کہ میری اونٹنی کو چھوڑ دو، اسے جہاں حکم ہو گا رک جائے گی اور انہی لوگوں کا میں مہمان ہوں گا۔ اونٹنی جہاں رکی وہاں سے قریب ترین گھر حضرت ابوایوب انصاری کا تھا جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمایا اور چھ ماہ تک وہاں فروکش رہے لیکن حضرت اسعد بن زرارہ نے یہ خیال کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی کہ ازلی سعادت تو اب حضرت ابوایوب انصاری کے حصے میں آ گئی تو میں کسی اور ذریعہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی خدمت کرلوں۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کی باگ انہوں نے پکڑ لی اور اسے اپنے گھر لے کر گئے اور اس کی خدمت کی توفیق انہیں کو ملتی رہی۔ (مسلم شریف: ج ۳،ص ۱۶۲۳)

حضرت اسعد ابن زرارہ رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق صادق تھے۔ مخیّر لوگوں میں ان کا شمار تھا۔ اپنے قبیلے کے

رئیس اور سردار بھی تھے۔اس زمانے میں جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ آئے تو سب کچھ چھوڑ کے آ گئے تھے۔ مدینے میں نئی جگہ آباد کاری کی کئی ضروریات سامنے تھیں۔حضرت اسعد بن زرارہ نے اسی موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حسب ضرورت وہ تحفہ پیش کیا جس کا احادیث میں ذکر آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں بہت عمدہ خوبصورت قسم کا پلنگ تھا جس کے پائے ہاتھی دانت کے بنے ہوئے تھے اور جو حضرت اسعد بن زرارہ نے بطور تحفہ دربار نبوی میں پیش کیا تھا۔(زادالمعاد: ج ا،ص ۱۳۲)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری پر جب مسلمانوں کے لیے مسجد کے قیام کی ضرورت پیدا ہوئی تو وہی احاطہ جو سہل اور سہیل کا تھا، وہاں مسجد نبوی تعمیر کرنے کی تجویز ہوئی۔حضرت اسعد نے یہ مخلصانہ پیشکش کی کہ ان دونوں بچوں کو میں راضی کرلوں گا، یہ زمین مسجد کے لیے قبول کر لی جائے اور اس کے عوض انہوں نے بنی بیاضہ والا اپنا باغ پیش کر دیا۔(زرقانی: جلد اول،ص ۲۶۴)

روایات میں آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رقم دیئے بغیر وہ قطعہ زمین قبول کرنے پر رضامندی نہیں فرمائی۔

بیماری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت:

حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر سے پہلے ہی بیمار ہو کر وفات پا گئے۔ان کو ایسی بیماری لاحق ہوگئی جس سے چہرہ اور جسم سرخ ہوجاتا ہے۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق اس بیماری کا علاج داغنے سے کیا جاتا تھا۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینے ہجرت کے بعد حضرت اسعد وفات پانے والے پہلے فرد ہیں۔ہجرت کے بعد مدینہ میں مسلمانوں کے لیے نیا ماحول تھا۔ یہود کی دشمنی الگ تھی اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فکر لاحق تھی کہ اس عاشق صادق اور وفا شعار صحابی کی بیماری یا وفات دشمن کی خوشی کا موجب نہ ہو۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسعد کی عیادت کے لیے ان کے گھر تشریف لے گئے۔ان کی بیماری کا حال دیکھ کر آپ نے پہلے ہی تقدیر الٰہی کا مسئلہ کھول کر بیان کر دیا اور فرمایا:''حضرت اسعد اس بیماری سے جانبر نہیں ہوسکیں گے اور یہود طعنہ زنی کریں گے کہ دیکھو! یہ کیسا نبی ہے اپنے وفا شعار ساتھی کو بھی بچا نہیں سکا۔''

یہاں غور کرنے کرنے والی بات یہ ہے کہ تقدیر مبرم معلوم ہوجانے پر بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علاج اور تدبیر نہیں چھوڑی۔حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورے سے بالآخر داغنے کا علاج کیا گیا مگر تقدیر الٰہی غالب آئی اور حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ اسی بیماری سے واصل بحق ہو گئے۔

(اسدالغابہ: ج ا،ص ا ۷۔طبقات ابن سعد: ج ۳،ص ۶۱۱)

بعد وصال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کمال محبت اور تعلق کا اظہار فرمایا اور خود ان کے غسل دینے میں شریک ہوئے۔ انہیں تین چادروں کا کفن پہنایا اور خود نماز جنازہ پڑھائی۔حضرت اسعد وہ پہلے خوش قسمت صحابی تھے جو جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے جنازہ کے ساتھ آگے آگے چلتے ہوئے جنت البقیع تک گئے اور یوں ایک اعزاز کے ساتھ اپنے وفا شعار ساتھی کی تدفین فرمائی۔(طبقات ابن سعد: ج ۳،ص ۶۱۲)

حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کا وصال جنگ بدر سے پہلے اور ہجرت نبوی کے چھ ماہ بعد شوال کے مہینے میں ہوئی اور اس وقت مسجد نبوی کی تعمیر جاری تھی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت اسعد بن زرارہ کی محبت کا یہ عالم تھا کہ جو تین بیٹیاں کبشہ، حبیبہ اور فارعہ چھوڑیں، ان کی وصیت اپنے آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی میری بچیوں کے نگران ومحافظ ہوں گے اور ان کے حق میں جو مناسب فیصلہ ہو وہی فرمائیں گے۔چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ حق خوب ادا کیا اور حضرت اسعد کی بچیوں کو اپنے گھر میں لے آئے۔وہ آپ کے کنبہ کی طرح آپ ہی کے گھر میں رہتی تھیں۔ آپ کے گھر میں ہی پلی بڑھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا بہت خیال رکھا۔بعد کے زمانے میں جب مختلف جنگوں میں مال غنیمت آیا جس میں سونا اور کچھ موتی تھے تو ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان بچیوں کو بھی اس میں سے تحفہ عطا فرمایا۔

(طبقات ابن سعد: ج ۳،ص ۶۱۱۔استیعاب: ج ا،ص ۱۷۵)

حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان کے قبیلے کے لوگ حاضر ہوئے اور عرض کیا:............ (بقیہ ص ۷۴ پر)

●●

گاھے گاھے باز خواں

غلام معین الدین امجدی

اسلامی تعلیمات اور راہ اعتدال

بے اعتدالی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ایک ہی مسلک کے لوگ گروپوں میں تقسیم ہو گئے اور ہر گروپ ایک دوسرے کے خلاف ایسے تیر ونشتر چلاتا ہے جیسے کہ صرف وہی جنتی ہے اور مخالف گروپ جہنمی

وسعت نظر یقیناً وسعت مطالعہ سے پیدا ہوتی ہے۔ عصر حاضر میں اعتدال کی ضرورت واہمیت میں خاصہ اضافہ ہو گیا ہے کیونکہ بعض تنگ نظر اور ایک ہی مسلک یا نقطہ نظر کو شوق سے پڑھنے والے افراد فریق مخالف کے نقطہ نظر کو سننا پسند کرتے ہیں اور نہ اس کی مجلس میں بیٹھتے ہیں، فتویٰ کی زبان سے اپنی رائے سے اختلاف کرنے والے ہر مخالف شخص کو کافر ومشرک اور منافق جیسے سخت کلمات کہنے سے بھی باز نہیں آتے اسی بے اعتدالی کی وجہ سے بعض اوقات وہ اپنی فکر میں اس حد تک متشدد ہو جاتے ہیں کہ خود کو ہی صحیح اور حق بجانب خیال کرتے ہیں، خود کو جنتی اور فریق مخالف کو جہنمی، جاہل اور قابل گردن زدنی تصور کرتے ہیں۔ بالآخر یہی سوچ انتہا پسندانہ نظریات کو جنم دیتی ہے جو ایک اچھے، پرامن اور مثالی معاشرے کی علامت نہیں ہے۔ اگر اس غلط تصور کی تردید نہ کی جائے تو مجلس ومحافل قتل گاہ اور میدان جنگ کا منظر پیش کریں گی۔ اللہ تعالیٰ اپنی کرم نوازی سے ہر دور میں ایسے کئی لوگ پیدا کرتا ہے جن کی مخلصانہ کوششوں سے انتہا پسندی کے زور کو مکمل ختم تو نہیں مگر کم ضرور کیا جا سکتا ہے۔

اس شدید ترین ضرورت کے پیش نظر زیر مطالعہ مختصر مگر تحقیقی مضمون میں اعتدال کے متعلق اسلامی تعلیمات کا ایک مختصر سا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے لغوی اور اصطلاحی معانی بیان کرنے کے بعد قرآن وسنت اسلامی تعلیمات کے بے مثال ورثہ سے اور سلف صالحین کے تذکار جمیلہ سے کچھ مثالیں پیش کی جائیں گی جس سے نہ صرف شدت پسندی کے طوفان کو روکنے میں مدد ملے گی بلکہ یقیناً ہٹ دھرمی پر مبنی سوچ کو تبدیل کرنے کا فائدہ بھی حاصل ہوگا۔

لغوی واصطلاحی معانی:

اعتدال عدل (ع د ل) سے مشتق ہے جو باب افتعال کا مصدر ہے، جس کے معانی لغت عرب میں انصاف، پیمانہ یا سیدھا معاملہ، امر معتدل یعنی دو حالتوں میں سے متوسط حال اختیار کرنا۔

(المنجد: دارالاشاعت اردو بازار کراچی، تاریخ اشاعت جولائی 1975ء)

وَالْاِعْتِدَالُ تَوَسّطُ حَالٍ بَيْنَ حَالَيْنِ فِيْ كَمٍ اَوْ كَيْفٍ وَكُلّ مَاتَنَاسَبَ فَقَدْاِعْتَدَلَ

(ترتیب القاموس المحیط: ج الثالث، ص ۱۷۲)

کسی چیز کی کمیت اور کیفیت کی دونوں حالتوں میں سے درمیانی حالت کو اختیار کرنا اور ہر چیز کا تناسب قائم کرنا اعتدال کہلاتا ہے۔

کلمۂ عدل قرآن میں:

(۱) قرآن مجید میں عدل کا کلمہ تقریباً ۲۸ دفعہ مصدر، ماضی، مضارع اور امر کے صیغوں میں استعمال ہوا ہے۔ عدل کے معانی کی وضاحت کے لیے درج ذیل سطور میں مشتے از خروارے چند قرآنی آیات پیش کی جا رہی ہیں۔

(الف) سورۃ النساء میں نکاح مسنون کی تعداد چار تک بیان کی گئی ہے، تمام بیویوں کے حقوق مساویانہ ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے عدل کی شرط لگائی ہے:

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلاَّ تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (النساء: آیت ۳)

پھر اگر تمہیں یہ خطرہ ہو کہ تم (ان میں) انصاف نہ کر سکو گے تو (صرف) ایک سے نکاح کرو۔

(ب) لین دین اور تجارت کے معاملات کو شفاف رکھنے اور جھگڑے سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے تحریری دستاویز تیار کرنے کا حکم دیا تو اس وقت بھی لکھنے اور لکھانے والوں کو عدل کی ہی تعلیم ارشاد فرمائی ہے:

وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ (البقرہ: آیت ۲۸۲)

اور تمہارے درمیان کسی کاتب کو عدل کے ساتھ دستاویز لکھنی چاہیے۔

(ج) اس کے علاوہ قرآن پاک میں قسط کا کلمہ بھی عدل کے

متعلم: شعبہ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی۔

معانی میں استعمال ہوا ہے۔

فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ

پھر اگر وہ اللہ کے (حکم کی طرف) رجوع کر لے تو ان میں عدل کے ساتھ صلح کرادو اور انصاف سے کام لو، بے شک اللہ انصاف سے کام کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ (الحجرات: آیت ۹)

کلمہ اعتدال احادیث مبارکہ میں:

قرآن مجید کی طرح اعتدال کا کلمہ احادیث مبارکہ میں بھی سیدھا ہونا اور ٹھیک ہونے کے معانی میں استعمال ہوا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے درج ذیل حدیث مبارکہ میں نماز با جماعت کے وقت صفوں کے ٹھیک اور معتدل ہونے کی اہمیت کو یوں بیان فرمایا ہے:

فَاِنَّ اِعْتِدَالَ الصُّفُوْفِ مِنْ تَمَامِ الصَّلَاةِ

(المؤطا: ج ۱ ص ۱۰۴، کتاب الجمعۃ، باب ماجاء فی الانصات یوم الجمعۃ والامام یخطب)

بے شک صفوں کا اعتدال (سیدھا ہونا) نماز کے مکمل ہونے کی نشانی ہے۔

فقہائے کرام کا طرز اعتدال:

علم کے جس شعبے میں دین اسلام کی روشنی میں روزمرہ کے سیاسی، معاشی، عائلی اور معاشرتی مسائل کی وضاحت کی جاتی ہے اور پیش آنے والے نت نئے مسائل کا حل معلوم کیا جاتا ہے، اس کو علم فقہ کہتے ہیں اور ان کی تشریح کرنے والوں کو فقہائے کرام کہا جاتا ہے۔ ان فقہائے اسلامی کی وسعت ظرفی کا یہ عالم ہے کہ ان کے درمیان حلال و حرام تک کا اصولی اور علمی اختلاف موجود ہے۔ یعنی ایک فقیہ ایک چیز کو دلیل کی بنا پر حلال کہتا ہے، دوسرا اسی چیز کو دلیل کی بنا پر ہی حرام قرار دیتا ہے۔ کتب فقہ میں ہر صفحے پر اس اختلاف کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ اسی اختلاف کی بنا پر فقہ مالکی، فقہ حنفی، فقہ شافعی، فقہ حنبلی اور فقہ جعفری وجود میں آئی ہیں۔ یہ ذہن انسانی کے تنوع کی دلیل بھی ہے۔ اس علمی تنوع کو خوشی سے قبول کرنا قلبی وسعت کی نشانی ہے لیکن قابل غور اور لائق توجہ امر یہ ہے کہ اس علمی و فقہی اختلاف کے باوجود ان کے مابین کوئی تنازع اور تصادم نہیں ہے۔ ان کے مابین جملہ علمی آداب کا پاس کیا جاتا ہے اور بے حد احترام آدمیت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو دلیل شرعی کی بنا پر رائے کے اختلاف کی وجہ سے کافر قرار نہیں دیتے بلکہ وہ اپنی دلیل اور نکتہ نظر کو از حد درست اور صحیح خیال کرنے کے باوجود اس میں غلطی ہونے کا امکان موجود سمجھتے ہیں۔ صحیح دلیل شرعی معلوم ہو جانے کے بعد ہٹ دھرمی کی راہ اختیار نہیں کرتے بلکہ شرح صدر کے ساتھ اپنی رائے سے رجوع بھی کر لیتے ہیں۔ یہ ان فقہائے کرام کے معتدل مزاج، وسیع النظر اور صاحب بصیرت ہونے کی دلیل ہے۔ فقہ شافعی کے بانی امام محمد بن ادریس الشافعی (متوفی: ۲۰۴ھ) اکثر و بیشتر کہا کرتے تھے:

رَاْيِي صَوَابٌ يَحْتَمِلُ الْخَطَاءَ وَرَاْئُ غَيْرِيْ خَطَاءٌ يَحْتَمِلُ الصَّوَابَ

(تاریخ المذاہب الاسلامیہ، محمد ابوزہرہ، ج ۱ ص ۱۸، دار الفکر للطباعۃ والنشر)

میری رائے درست لیکن غلطی کا احتمال رکھتی ہے جب کہ میرے غیر کی رائے غلط لیکن درستگی کا احتمال رکھتی ہے۔

اعتدال پسندی کی اعلیٰ مثال:

یہ فقہائے کرام قلبی طور پر اس قدر اعتدال پسند اور رواداری کے اخلاقی اصول پر عمل کرنے والے تھے کہ علم فقہ کے بانی ہونے کا عجب وغرور اور نخوت و تکبر ان کے نزدیک تک نہ پھٹکتا تھا، ان کی ردائے باطن کو میلا تک نہیں ہونے دیتا تھا۔ امام محمد ادریس الشافعی (م: ۲۰۴ھ) جب اپنے دادا استاد امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت (م: ۱۵۰ھ) کے مزار پر انوار پر شہر بغداد کے محلہ اعظمیہ میں حاضری اور دعا کے لیے گئے تو آپ نے وہاں اپنی فقہ کے مطابق نماز میں رفع یدین نہیں کیا۔ جب ان کے تلامذہ نے بعد میں ان سے نماز میں رفع یدین نہ کرنے کی وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا:

مجھے اپنے دادا استاد کے پاس اپنی فقہ کے مطابق رفع یدین کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔

(مناقب امام اعظم ابوحنیفہ، مصنف مولانا عبدالرزاق بھترالوی ص ۱۴۱، مکتبہ لاثانیہ لاہور)

یہ امام شافعی کی اعتدال پسندی اور وسعت ظرفی کی اعلیٰ مثال ہے۔ وہ عملی طور یہ سمجھتے ہیں، اس کے باوجود کہ میں رفع یدین کرنے کے نکتہ نظر میں حق بجانب ہوں لیکن میرے اس اصولی اجتہاد میں

معمولی سی خطا کا امکان موجود ہے، وہ امام اعظم سے دلیل کی بنیاد پر اختلاف رائے کو انا کا مسئلہ نہیں بناتے بلکہ عملی طور پر اگر اپنی رائے کے خلاف بھی دوسرے کو کبھی ترجیح دینے کا موقع آجائے تو اس پر عمل کرتے ہوئے شرم محسوس نہیں کرتے ہیں۔ اس سے ان کے ایک مستقل فقہی نکتہ نظر الشافعی کے بانی ہونے اور ان کے فقہی مقام و مرتبے میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

اعتدال کا سبب:

اگر معمولی سا غور کر لیا جائے تو یہ عقدہ بڑی آسانی سے سمجھ آجاتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فقہی اور فروعی مسائل میں اجتہادی رائے کو خطا کے باوجود بھی ایک صواب کا مستحق قرار دیا ہے جبکہ صحیح اور صائب رائے کو دو اجروں کا مستحق قرار دیا ہے۔ اس سے یہ راز منکشف ہوتا ہے کہ دین میں سوچ و بچار اور نیک نیتی سے کوشش کسی سطح پر بھی کی جائے وہ عنداللہ (اللہ کے نزدیک) اجر وثواب کی مستحق ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

اِذَا اجۡتَهَدَ الحَاكِمُ فَاَصَابَ فَلَه اَجۡرَانِ وَاِنۡ اَخۡطَاءَ فَلَه اَجۡرٌ وَّاحِدٌ

(صحیح مسلم: کتاب الاقضیہ، باب بیان الاجر الحاکم اذا اجتہ فاصاب او اخطاء، حدیث ۱۷۱۶)

جب حاکم اجتہاد کرے اور اس میں درست نتیجے کو پہنچے تو اس کے لیے دو اجر ہیں اور اگر غلطی کر جائے تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔

اس حدیث پاک کو اگر غور سے پڑھا جائے تو اس کا بہت بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ جن مسائل میں قرآن وسنت کی کوئی رائے صاف معلوم نہ ہورہی ہو تو ان دو بڑے ماٰخذ شرعیہ کی روشنی میں مجتہدین مقاصد شرعیہ کو سامنے رکھتے ہوئے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح ان کا وقت خدمت خلق میں بسر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر وثواب بھی نصیب ہوتا ہے اور طبیعت میں اعتدال قائم رہتا ہے، یہ فقہائے کرام اپنی رائے قائم کرتے ہوئے یہ بھی سوچتے ہیں کہ جس طرح میں نے اس امر شرعی میں کوشش کی ہے، اسی طرح دوسرے فقیہ نے بھی اجتہاد کیا ہے جس کے نتیجے میں اس نے بھی ایک رائے قائم کی ہے۔ یقیناً نظر وفکر کے اس انداز سے ہٹ دھرمی کا خاتمہ ہوگا، نظر و فکر میں وسعت پیدا ہوگی، برداشت کی صفت آئے گی اور مسائل شرعیہ میں غور وخوض اور اجتہاد کی نئی راہیں بھی کھل جائیں گی۔

بے اعتدالی زیادتی ہے:

قرآن مجید میں کئی مقامات پر اللہ تعالیٰ کے دشمنوں سے قتال اور جنگ کرنے کا حکم دیا گیا جو جہاد کی ایک اعلیٰ قسم ہے۔ اللہ کریم نے قتال جیسے غیظ وغضب کے ماحول میں بھی اخلاقی اقدار کے ملحوظ خاطر رکھنے کا یعنی دشمن پر زیادتی کرنے سے منع فرمایا کیونکہ یہ اعتدال کے خلاف ہے اور اللہ تعالیٰ اعتدال سے ہٹ جانے والوں اور زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَقَاتِلُوۡا فِيۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ الَّذِيۡنَ يُقَاتِلُوۡنَكُمۡ وَلَا تَعۡتَدُوۡا ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الۡمُعۡتَدِيۡنَ

اور اللہ کی راہ میں ان سے (دفاعاً) جنگ کرو جو تم پر جنگ مسلط کرتے ہیں مگر حد سے نہ بڑھو، بے شک اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔ (البقرہ: آیت ۱۹۰)

تبلیغ دین اور اعتدال:

اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو دین دعوت بنایا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی امت شرق وغرب کے تمام بے دینوں اور غیر مسلموں کو اس الہامی دین کو قبول کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ دعوت قبول کرنے والوں میں ہر انسان یعنی یہودی، نصرانی، ہندو، سکھ، مجوسی اور دہریے جیسے لوگ بھی شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس دین کو پہنچانے کا جو طریقہ اختیار کرنے کا حکم دیا۔ قرآن مجید کی درج ذیل آیت میں حکمت اور دانائی یعنی اعتدال کو قائم رکھنے کا اولین حکم فرمایا، اچھی نصیحت اور دلائل کا تذکرہ بعد میں فرمایا:

اُدۡعُ اِلٰى سَبِيۡلِ رَبِّكَ بِالۡحِكۡمَةِ وَالۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ وَجَادِلۡهُمۡ بِالَّتِيۡ هِيَ اَحۡسَنُ (النحل: آیت ۱۲۵)

آپ اپنے رب کی راہ کی طرف دعوت دیجیے حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ اور ان سے بحث بھی اچھے دلائل کے ساتھ کرو۔

اعتدال اور صوفیائے کرام:

تاریخ اسلام میں انسانیت کے جس گروہ میں سب سے زیادہ اعتدال پایا جاتا ہے وہ صوفیائے کرام ہیں کیونکہ وہ مجاہدہ نفس کے ذریعے طبیعت کے شر پسندانہ عناصر کو ختم کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ علم نافع کی کوشش جاری رکھتے ہیں، اپنے سمیت سب کو

علم غیر نافع کے نقصانات وحجابات سے بچنے کی ترغیب دیتے ہیں، طبیعتوں میں اعتدال پیدا کرنے کے لیے عبادت و ریاضت میں کثرت، احترام آدمیت کے درس کے ساتھ کم خوری کو عادت ثانیہ بناتے ہیں، علمی وفقہی اختلافات کو لفظی نزاع تصور کر کے بات کو طول دینے سے احتراز کرتے ہیں، وصلِ الٰہی کے لیے ہٹ دھرمی اور تصادم وتخاصم کو حجاب سمجھتے ہیں، خواہ وہ علمی ہی کیوں نہ ہو کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ تمام فقہی مسالک اور ان کا امت مسلمہ میں معمول جاری رہنا اور امت مسلمہ کا ایک متعدد حصے کا ان کی فقہ کو قبول کرنا ہی ان کے حسن نیت اور مقبول سعی کی علامت ہے۔

عدم اعتدال کے نقصانات ونتائج:

بے اعتدالی نے عصر حاضر میں فرقہ واریت کا جو طوفان بدتمیزی بپا کیا ہے، اس نے باہمی نفرتوں کو جنم دیا ہے، باہمی محبتوں کا جنازہ نکال دیا ہے، یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہر شخص اپنے مسلکی مخالف پر سنگ باری کرنا اپنا فرض منصبی سمجھ رہا ہے، خواہ وہ لفظوں سے ہو یا پتھروں سے، ڈنڈے سے ہو یا گولی سے۔ تاریخ اسلام کی ورق گردانی کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سقوط بغداد اور زوال امت مسلمہ کی دیگر وجوہات میں سے ایک وجہ شیعہ سنی فسادات بھی تھے، اس سے معلوم ہوا انتشار و افتراق اقوام کو ریت کی دیوار کی طرح گرا دیتا ہے، جو قوم منفی سوچ اور خود پسندی کی دلدل میں پھنس جائے، وہ ہیچو ما دیگرے نیست کی لاعلاج مرض میں مبتلا ہوجاتی ہے، جس کے بڑے بھیانک نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ قومی معیشت زوال پذیر ہوجاتی ہے، اخلاقی اقدار معاشرے سے عنقا ہوجاتی ہیں، مجموعی حیثیت سے قوم انحطاط کا شکار ہوجاتی ہے، ہر شعبہ زندگی اس سے متاثر ہوتا ہے، قوم کا قیمتی سرمایہ یعنی وقت ضائع ہوتا ہے پھر قوم کو جانی و مالی نقصان سے کوئی بچا نہیں سکتا، معاشرتی امن و امان تباہ ہوجاتا ہے۔ ہر طرف جنگل کا قانون نظر آتا ہے، اصولوں کی کوئی پاسداری نہیں ہوتی۔ عدم اعتدالی کے نقصانات کا اگر دیانت داری سے تجزیہ کیا جائے تو ہر گلی اور محلہ جنگ کا نقشہ پیش کرے گا، ہر طرف سے الامان والحفیظ کی صدائیں بلند ہوں گی۔

بے اعتدالی سے حفاظت کیسے؟

بے اعتدالی کے نقصانات سے محفوظ رہنے کے لیے درج ذیل سطور میں چند قابل عمل تجاویز پیش کی جا رہی ہیں، جن پر پُرخلوص طریقے سے عمل کرنے سے ہم بہت بڑے خطرات سے بچ سکتے ہیں۔

ہر سطح پر تعلیم کو عام کیا جائے۔

انسانی شعور کو بیدار کیا جائے۔

اپنے اندر حوصلہ اور برداشت کی اخلاقی صفات پیدا کی جائیں۔

ہر دوسرے شخص میں اچھی صفات تلاش کی جائیں۔

فرقہ واریت پیدا کرنے والے لٹریچر پر پابندی لگائی جائے۔

تبلیغی واصلاحی پروگراموں کے لیے اندرونی سپیکر استعمال کیے جائیں۔

مشاہیر اسلام پر طعن وتشنیع کی زبان بند کی جائے۔

وعظ و بیان کے لیے مشترکہ اخلاقی عنوانات کو تجویز کیا جائے۔

تمام مسالک اصلاح معاشرہ کے لیے مثبت کردار ادا کریں۔

اپنی ذات سے ہر اچھے کام کا آغاز کر دیا جائے۔

خلاصہ:

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن مجید نے اعتدال کو نہ صرف پسند کیا ہے بلکہ کافروں کے باطل خداؤں یعنی بتوں کو گالیاں دینے سے بھی منع کیا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ راہ اعتدال سے ہٹ کر اور ضد میں آ کر مسلمانوں کے سچے واحد خدا کو ہی برا بھلا نہ کہنا شروع کر دیں۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (الانعام: آیت ۱۰۸)

اور اللہ کے سوا جن کی یہ پرستش کرتے ہیں تم انہیں برا بھلا نہ کہو (ایسا نہ ہو کہ) وہ بھی اللہ کو زیادتی کرتے ہوئے جہالت سے برا بھلا کہنے لگیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علم وعمل اور عبادت وریاضت کے ہر شعبے میں ہمیشہ اعتدال کی راہ اختیار کی ہے۔ صحابہ کرام علیہم الرضوان نے بھی نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعمال وافعال اور اقوال وگفتار سے اعتدال کو نہ صرف پسند کیا بلکہ عمل کر کے دائمی سرخروئی حاصل کی ہے۔ فقہائے کرام نے دلیل کی بنیاد پر باہمی اختلاف کے باوجود اعتدال کی اخلاقی صفت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا بلکہ ہر ممکن اس پر عمل کیا ہے۔

●●

مجھے ہے حکم اذاں

آدابِ مسجد اور ہمارے رویے

سیّد شبیر احمد

ہم اپنے آپ سے سوال کریں کہ کیا مسجدوں کے ساتھ ہمارا رویہ اس کی شایان شان ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب ہر نمازی اپنے ضمیر سے لے، یقین جانیے! ضمیر کبھی جھوٹ نہیں بولتا

اس مادی دور میں ہمارا مسجد کے ساتھ تعلق بھی تنزل پذیر ہے۔ اگر ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ پر نظر ڈالیں تو آپ کی مسجد سے وابستگی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے مثلاً روزانہ پانچ وقت فرض نماز کی ادائیگی کے علاوہ جب کبھی کوئی مشکل پیش آتی تو آپ مسجد کا رُخ فرماتے اور نفل ادا کرنے کے بعد دُعا فرماتے۔ سورج گرہن ہوتا یا چاند گرہن آپ مسجد میں تشریف لے جاتے اور نوافل ادا فرماتے۔ سفر سے واپسی پر پہلے مسجد تشریف لے جاتے، نوافل ادا فرماتے اور پھر گھر تشریف لے جاتے، علیٰ ہذا القیاس۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے (سورۂ احزاب، آیت ۲۱)۔ جس کی پیروی کرتے ہوئے ہمارا مسجدوں سے گہرا تعلق قائم رکھنا لازم ہے۔

مسجد کی طرف باجماعت نماز ادا کرنے کے لیے جانے والے نمازی کے عزّو شرف کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بندہ جس وقت بھی صبح کو یا شام کو اپنے گھر سے نکل کر مسجد کی طرف جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے واسطے جنّت کی مہمانی کا سامان تیار کراتا ہے، وہ جتنی دفعہ بھی صبح یا شام کو جائے (متفق علیہ)۔ اس حدیث شریف کی رُو سے مسجد میں نماز ادا کرنے والا نمازی اللہ تعالیٰ کا مہمان ہوتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ مسجد میں آنے والوں کا میزبان ہے۔ (سبحان اللہ)

بات سمجھنے کے لیے اس مثال پر غور کریں۔ اگر کبھی ہمیں کوئی صاحبِ اقتدار یا جس ادارے میں ملازمت کرتے ہیں اس کے سربراہ (جو خوش یا ناراض ہو کر ہمیں کوئی دُنیاوی فائدہ یا نقصان پہنچانے کی حیثیت میں ہو) ہمیں اپنے گھر آنے کی دعوت دے تو ہمارے احساسات کیا ہوں گے؟ پہلے تو ہم خوشی سے پھولے نہیں سمائیں گے اور اپنے دوست واحباب میں فخر سے ذکر کریں گے۔ پھر غور کریں کہ ہمارا رویہ کیا ہوگا؟ اچھے سے اچھے لباس کا انتخاب کریں گے۔ وقت کی پابندی کو ملحوظ خاطر رکھیں گے اور میزبان کے گھر پہنچ کر پوری طرح اہتمام کریں گے کہ محفل کے آداب کے خلاف کوئی حرکت نہ سرزد ہوجائے جس سے ہمارے میزبان کو ناگواری کا احساس ہو، اور ہر طرح سے اپنے میزبان کی خوشنودی حاصل کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھیں گے۔ اب ہم اپنے آپ سے یہ سوال کریں کہ کیا مسجد میں بھی ہمارا ایسا ہی رویہ ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب ہر نمازی اپنے ضمیر سے لے، یقین جانیے! ضمیر کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔

کبھی ہم نے غور کیا کہ جب ہم مسجد میں ہوتے ہیں تو کس ذات کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں؟ کون ہمارا میزبان ہوتا ہے؟ کون سی باتیں یا حرکات اللہ تعالیٰ (ہمارے میزبان) کو ناپسند ہیں جن کی نشان دہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے؟ کیا ہمیں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ایک دُنیاوی میزبان سے بھی کم تر عزیز ہے؟ کیونکہ مساجد میں ہم وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ہم اپنے دُنیاوی میزبان کے گھر نہ کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جب بھی مسجد کا ذکر ہو تو اذان کا خیال آنا بالکل فطری عمل ہے۔ لہٰذا بات چیت کا آغاز اذان سے کرتے ہیں۔

اذان: فلاح (کامیابی) کی طرف اللہ تعالیٰ کا بلاوہ:

روزانہ پانچ مرتبہ اللہ تعالیٰ کا ہرکارہ (مؤذن) مسلمانوں کو مسجد میں نماز کی ادائیگی کی دعوت دیتا ہے۔ بڑے خوش نصیب ہیں وہ مسلمان جو مؤذن کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے مسجد کا رُخ کرتے ہیں۔ ان خوش نصیب بھائیوں سے گزارش صرف اتنی ہے کہ مسجد میں آکر سارا وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت میں صرف کریں اور خدارا ایسے کام جانے یا انجانے میں ہرگز نہ کریں جن سے مسجد کا تقدس مجروح ہو اور اللہ و رسول کے احکام کی خلاف ورزی ہو۔ مسجد میں آنے کی غرض و غایت اللہ تعالیٰ کی عبادت کرکے اپنی بخشش کا سامان کروانا

ہے نہ کہ ممنوع کام (مسجد میں دُنیاوی باتیں کرنا، شوروغل کرنا، نمازیوں کی نماز میں خلل ڈالناوغیرہ) کر کے گناہوں میں اضافہ کرنا۔

اذان کا جواب دینے والے کے لیے جنّت کی خوش خبری:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے۔ حضرت بلال نے اذان دی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے پورے یقین کے ساتھ اذان کا جواب دیا وہ جنّت میں داخل ہوگا۔ (سنن نسائی: باب مواقیت الصلوٰۃ، حدیث/۱۶۴۱)

اذان کا مسنون جواب:

حضرت عمر سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد فرمایا کہ ہر کلمہ کا جواب وہی کلمہ ہے (یعنی جو کلمہ مؤذن کہے وہی کلمہ اذان سننے والا کہے) سوائے حی علی الصلوٰۃ، حی علی الفلاح کے۔ ان کے جواب میں لاحول ولا قوۃ اِلَّا باللہ کہنا چاہیے۔ (مسلم: کتاب الصلوٰۃ، باب القول مثل قول المؤذن، حدیث/۸۷۶)

بعد اذان دُعا مانگنے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی بشارت

حضرت جابر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس شخص نے اذان سن کر یہ کلمات کہے: اَللّٰھُمَّ رَبَّ ھٰذِہِ الدَّعْوَۃِ التَّآمَّۃِ وَالصَّلٰوۃِ الْقَآئِمَۃِ اٰتِ مُحَمَّدَانِ الْوَسِیْلَۃَ وَالْفَضِیْلَۃَ وَابْعَثْہُ مَقَامًا مَّحْمُوْدَا الَّذِیْ وَعَدْتَّہٗ اے اللہ! اس دعوتِ کامل اور قائم ہونے والی نماز کے عطا فرما محمد کو وسیلہ اور فضیلت اور فائز فرما آپ کو مقامِ محمود پر جس کا تونے وعدہ فرمایا ہے ان سے''، تو قیامت کے دن اس کی سفارش کرنا میرا ذمہ ہوگا۔ (صحیح بخاری: کتاب الاذان، باب الدعاء، عندالنداء، حدیث/۵۷۹)

سبحان اللہ! کتنا قلیل عمل اور اتنا بڑا اجر! کیا ہم ایسے شخص کی طرح ہونا پسند کریں گے کہ اذان ہورہی ہو اور وہ خوش گپیوں اور ہنسی مذاق میں مشغول ہو کہ اتنے بڑے اجر سے محروم ہوجائے؟ یقیناً نہیں، لہٰذا اذان خاموشی سے سنیں اور جواب دیں۔ پھر مسنون دُعا مانگ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے حق دار بن جائیں۔

مسجد جانے سے پہلے صاف ستھرے لباس کا اہتمام:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''اے اولادِ آدم! تم مسجد میں حاضری کے وقت اپنے آپ کو (صاف ستھرے لباس سے) مزین کرلیا کرو اور خوب کھاؤ اور پیو اور حد سے نہ نکلو۔ بے شک اللہ تعالیٰ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔ (الاعراف: آیت/۳۱)

مسجد میں داخل ہونے سے پہلے موبائل فون ضرور بند کردیں:

مسجد میں ہر وہ کام کرنا منع ہے جو نماز میں خلل ڈالے۔ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ ہر مسجد میں موبائل فون بند کرنے کا نوٹس لگا ہوتا ہے۔ خطیب حضرات بھی یاد دہانی کراتے رہتے ہیں۔ پھر بھی کسی نہ کسی کا فون بجتا ہے اور تمام نمازیوں کی نماز میں خلل ڈالتا ہے لہٰذا سب نمازی بھائیوں سے گزارش ہے کہ مسجد میں داخل ہونے سے پہلے اپنا موبائل فون ضرور بند کردیں اور مسجد کی انتظامیہ سے گزارش ہے کہ وہ مسجد میں موبائل فون جیمر (Jammer) لگادیں تاکہ نمازیوں کے خشوع وخضوع میں موبائل فون سے پیدا ہونے والے خلل کا سدباب ہوسکے۔

مسجد میں داخل ہونے کا ادب:

مسجد میں داخل ہوتے وقت پہلے دایاں پاؤں اندر رکھیں پھر یہ دُعا مانگیں: اَللّٰھُمَّ افْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِکَ اے اللہ! میرے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے۔ (مسلم: کتاب صلوٰۃ المسافرین، باب مایقول اذا دخل المسجد، حدیث/۱۶۸۵)

مسجد میں داخل ہونے کے بعد تحیۃ المسجد ادا کرنا:

حضرت قتادہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز ادا کرے''۔ (بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب اذا دخل احدکم المسجد فلیرکع رکعتین، حدیث/۴۲۵)

حضرت سیّدنا ابوقتادہ سے روایت ہے کہ ایک دن مَیں مسجد میں گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں بیٹھے ہوئے تھے تو میں بھی بیٹھ گیا۔ آپ نے فرمایا کہ کس نے روکا تم کو دو رکعت پڑھنے سے قبل بیٹھنے کے لیے؟ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! مَیں نے آپ کو اور لوگوں کو بیٹھے دیکھا (تو مَیں بھی بیٹھ گیا) تو آپ نے فرمایا: جب کوئی تم میں سے مسجد میں آئے تو جب تک دو رکعت نہ پڑھ لے، وہ نہ بیٹھے۔

(مسلم: کتاب الصلوٰۃ، باب استحباب تحیۃ المسجد برکعتین، حدیث/۱۶۸۸)

ان دونوں احادیث کریمہ سے تحیۃ المسجد کی اہمیت روزِ روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہے لیکن اگر فرض نماز کی جماعت ہورہی ہو تو یہ حکم

ساقط ہوجائے گا کیونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب فرض نماز کی اقامت ہوجائے تو سوائے فرض نماز کے کوئی دوسری نماز نہیں ہوتی۔(صحیح مسلم: کتاب صلوٰۃ المسافرین، باب استحباب تحیۃ المسجد، حدیث/۱۶۷۸)

یہ سنت کریمہ ہماری غفلت اور لاعلمی کی وجہ سے متروک ہوتی جارہی ہے۔ اس سنت کو ادا کرکے نماز کے ثواب کے ساتھ احیائے سنت کا ثواب بھی حاصل کریں۔

مساجد زمین پر اللہ تعالیٰ کی محبوب ترین جگہیں:

مساجد کا احترام کیجیے۔حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: شہروں اور بستیوں میں سے اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ان کی مسجدیں ہیں اور سب سے زیادہ مغضوب (ناپسندیدہ) ان کے بازار اور منڈیاں ہیں۔(صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب فضل الجلوس فی مصلاۃ، حدیث/۱۵۶۰)

مسجدوں کی صفائی اور خوشبو کے استعمال کا حکم:

اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محلوں میں مسجدیں بنانے کا حکم دیا اور یہ بھی حکم دیا کہ ان کی صفائی کا اور خوشبو کے استعمال کا اہتمام کیا جائے۔(صحیح ابن حبان: کتاب الصلوٰۃ، باب المساجد، ذکر الامر بتنظیف المساجد و تطبیقھا، حدیث/۱۶۳۴)

مسجد کی صفائی کا گراں قدر معاوضہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:''جو شخص مسجد کی گندگی نکالے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنّت میں گھر بنائے گا۔''

(ابن ماجہ: کتاب المساجد والجماعات، باب تطہر المساجد، حدیث/۷۵۷)

مساجد میں ممنوع مشاغل:

سیّدنا جابر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو پیاز یا لہسن کھائے وہ ہماری مسجد میں نہ آئے کیونکہ جس چیز سے آدمیوں کو تکلیف ہوتی ہے اس سے فرشتوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔(مسلم: کتاب المساجد، باب نھی من اکل ثوما او بصلاً، حدیث/۵۶۴)

اس حدیث مبارکہ کی رُو سے ہر بدبُودار چیز کھانے یا استعمال کرنے کے بعد جب تک منہ کی صفائی نہ کرلی جائے، حتیٰ کہ بدبُو ختم نہ ہوجائے مسجد میں آنا منع ہے۔

مسجدوں میں شوروغل مچانا:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ (لقمان: آیت ۱۹)

''اپنی رفتار میں میانہ روی اختیار کرو اور تم اپنی آواز کو کسی قدر پست رکھو۔ بلاشبہہ سب سے زیادہ ناپسندیدہ آواز گدھے کی ہے''۔

غور فرمائیں اگر عام دُنیاوی زندگی میں آواز پست رکھنے کا حکم ہے تو قابلِ احترام مساجد میں اُونچی آواز میں دُنیاوی بات چیت کی کیسے اجازت ہوسکتی ہے؟

مسجد میں شور کرنے پر تنبیہ:

حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دن مسجد میں سویا ہوا تھا۔ کنکری مار کر کسی نے جگادیا۔ دیکھا تو حضرت عمر فاروق تھے۔ آپ نے دو شخصوں کی طرف اشارہ کیا جو مسجد میں شوروغل کررہے تھے کہ ان کو پکڑ کر لاؤں۔ میں نے حسب الحکم دونوں کو حاضرِ خدمت کردیا۔ آپ نے پوچھا: کہاں رہتے ہو؟ ان لوگوں نے طائف کا نام لیا۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا: اگر تم مدینہ کے ہوتے تو تم کو سزا دیتا۔ تم مسجدِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں شوروغل کرتے ہو۔ جاؤ! آج صرف اس لیے معاف کرتا ہوں کہ تم باہر کے رہنے والے ہو''۔(صحیح بخاری: کتاب الصلوٰۃ، باب رفع الصوت فی المسجد، حدیث/۴۷۰)

چھوٹے بچوں اور شوروشغب سے مسجدوں کی حفاظت:

حضرت واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنی مسجدوں سے اپنے چھوٹے بچوں کو اور دیوانوں اور شرارتی لوگوں کو دُور اور الگ رکھو (ان کو مسجد میں نہ آنے دو) اور (اسی طرح مسجدوں سے الگ اور دُور رکھو) اپنی خرید و فروخت کو، اپنے باہمی جھگڑوں کو، اپنے شوروشغب کو، حدوں کو قائم کرنے کو اور تلواروں کو میانوں سے نکالنے کو۔ (یعنی ان میں سے کوئی بات بھی مسجدوں کی حدوں میں نہ ہو، یہ سب باتیں مسجد کے تقدس اور احترام کے خلاف ہیں)۔(سنن ابن ماجہ: کتاب المساجد، باب ما یکرہ فی المساجد، حدیث/۷۵۰)......(بقیہ ص ۴۲ پر)

●●

محمد بشیر جمعہ

براہ مہربانی! اپنی زندگی منظم کرلو

آپ لکھ کر رکھ لیں کہ یہ چند عادتیں اپنا کر آپ چند دنوں میں ہی حیرت انگیز طور پر اپنی زندگی بدل سکتے ہیں

وقت بچانا اور اس سے صحیح معنوں میں فائدہ اُٹھانا ہی کامیاب اور منظم زندگی کی طرف پہلا قدم ہے۔ یہی تنظیم وقت ہے۔ یاد رکھیے، وقت کو بچایا نہیں جا سکتا بلکہ اسے بہتر طریقے سے استعمال کرنے کو ہی وقت بچانا سمجھا جاتا ہے۔ وقت کی بچت کے سلسلے میں سب سے زیادہ ممد و معاون وہ شعور ہوتا ہے جو انسان وقت کی نسبت سے اپنے اندر پیدا کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ کچھ دیگر پہلو ایسے ہیں جن پر ہماری نظر رہنی چاہیے۔ ان میں سے بعض کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

یہاں وقت بچانے کے حوالے سے مختلف ماہرین کی آرا اور مشوروں کو جمع کیا گیا ہے۔ چند دن ان مشوروں پر عمل کریں۔ آپ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ نتائج غیر متوقع طور پر کتنے حوصلہ افزا ہیں۔ ہم نے ان مشوروں اور اشارات کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان اشارات میں اکثر کو پہلے گروپ میں ڈال کر آسانی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہیں کہیں ان کی نوعیت کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے: (۱) ذاتی یا انفرادی زندگی (۲) تعلیمی زندگی (۳) معاشی زندگی (دفتر اور کاروبار) (۴) خاندانی یا گھریلو زندگی (۵) معاشرتی یا قومی زندگی۔

ذاتی تربیت اور تنظیمِ وقت:

• وقت کو کنٹرول کرنا یا اس کا نظم و نسق قائم کرنا بہتر زندگی کی طرف پہلا قدم ہے۔ سب کو روزانہ وقت کی مساوی مقدار ملتی ہے۔ یہ سب انسان کے اختیار اور کنٹرول کی بات ہے کہ وہ کس طرح وقت کے کوٹے کو استعمال کرتا ہے اور کس طرح اس کی مدد سے اپنی زندگی میں بہتری لاتا ہے۔

• وقت کو قابو میں کرنا دراصل اپنے آپ کو قابو میں کرنا ہے۔

• جو لوگ وقت کو قابو میں کرنا چاہتے ہیں، وہ یہ بات یاد رکھیں کہ وقت کو کسی بھی حالت میں کنٹرول نہیں کیا جا سکتا۔ انسان اپنے آپ کو کنٹرول کر کے ہی وہ نتائج حاصل کر سکتا ہے جو وقت کو کنٹرول کرنے کے تصور سے وابستہ ہیں۔ کہنے کو ہم وقت گزار رہے ہوتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ وقت ہمیں گزار رہا ہوتا ہے۔

• اپنی مصروفیات کے لیے ہفتہ وار اور ماہانہ بنیاد پر منصوبہ بندی کیجیے۔

• ممکن ہو تو اپنے کاموں کے لیے مناسب کیلنڈر، ڈائری یا سوفٹ ویئر استعمال کیجیے اور اس کے ذریعے اپنے اوقات کی منصوبہ بندی کیجیے۔ اپنے کاموں کا معمول بنائیے۔

• اپنے آپ کو منظم کرنے اور اپنی استعداد کار بڑھانے کے لیے کچھ خرچ کر کے کتابیں، کیلنڈر، ڈائری، نوٹ بک، اسمارٹ فون یا لیپ ٹاپ خریدنے کی کوشش کیجیے۔ یہ پلاٹ کی مانند ہے، کچھ عرصے کے بعد آپ کو اس سے فائدہ حاصل ہوگا۔

• اپنے کیلنڈر کو مربوط رکھیے۔ ایک سے زائد کیلنڈر آپ کو اُلجھا دیں گے۔

• اپنے شب و روز کا جائزہ لیجیے اور ٹی وی یا انٹرنیٹ یا ٹیلی فون کو دیا جانے والا وقت کم کیجیے تاکہ مستقبل کی تیاری کے لیے وقت میسر ہو۔

• وقت کو بہتر طور پر اسی وقت گزارا جا سکتا ہے جب اس کے لیے بہتر منصوبہ بندی کی گئی ہو۔ صرف کام دھندے کے حوالے سے ہی نہیں بلکہ گھر والوں کے ساتھ گزارے جانے والے وقت، خریداری، تفریح، ورزش، کھانے پینے، روزمرہ کے کاموں اور دیگر امور کے حوالے سے بھی منصوبہ بندی کیجیے۔ فون اور ای میل کا جواب دینے کے لیے آپ کو وقت مختص کرنا چاہیے تاکہ اس سلسلے میں وقت نہ ضائع ہو اور نہ بہت کم مختص کیا ہوا محسوس ہو۔

• منصوبہ بندی کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ اس پر پوری طرح عمل کیا جائے۔ آپ نے جو وقت جس کام کے لیے مختص کیا ہے اس وقت وہی

کام ہونا چاہیے اور کسی دوسرے کام کے بارے میں سوچنا بھی فضول ہے۔ اپنی ساری توانائی اس کام پر خرچ کردیں تاکہ وہ کام اسی وقت کے اندر ہوجائے۔ یہ منصوبہ بندی کا حاصل ہے۔

• جب آپ کام کرنے لگتے ہیں تو بہت ساری چیزیں خود آپ کو یاد آتی ہیں جو کہ آپ کی توجہ کو منتشر کرتی ہیں اور انہماک میں خلل ڈال کر آپ کو دوسرے راستے پر لے جاتی ہیں۔ جب آپ منصوبہ بندی کے تحت کوئی کام کرنے بیٹھیں تو انہماک میں خلل ڈالنے والی ہر چیز کو آنے سے روکنے کی صلاحیت بیدار کرلیں۔ کمرے کا دروازہ بند رکھیں، ٹیلی فون کی گھنٹی کو خاموش کردیں اور اہلِ خانہ سے کہیں کہ انتہائی ضرورت کے سوا آپ کو زحمت نہ دیں۔

• کام کے دوران ہر ۴۰ منٹ کے بعد تین منٹ کا وقفہ ضرور کریں۔ چند لمحات فراغت کے نکال کر سیر کیجیے یا اپنی تھکن دور کرنے کی کوشش کیجیے تاکہ آپ کا ذہنی بوجھ کم ہوجائے۔

• ہر روز صبح اپنا دن بھر کا منصوبہ بنالیں اور جو کام کرنے ہیں انھیں کسی ڈائری یا کاغذ پر لکھ لیجیے۔ جو کام مکمل ہوجائیں انھیں کاٹ دیں یا 'کرنے کے کام' فہرست پر نشان لگادیں۔

• خیال بھی ایک نعمت ہے۔ کاغذ یا چھوٹی نوٹ بک ہمیشہ اپنی جیب میں رکھیں تاکہ فارغ اوقات میں جب کوئی منصوبہ یا نیا خیال آپ کے ذہن میں آئے تو اسے فوراً لکھ لیں۔

• آرام کے اوقات مقرر کرکے انھیں نماز کے اوقات سے ہم آہنگ کرلیں۔

• فارغ اوقات کو لکھنے پڑھنے، کوئی چیز یاد کرنے یا کوئی تعمیری کام کرنے میں استعمال کریں۔

• اگر آپ کا گزر اپنے پسندیدہ فلنگ اسٹیشن (پٹرول پمپ یا گیس اسٹیشن) کے پاس سے ہو تو اپنی کار کی پوری ٹنکی بھروالیں تاکہ صرف ایندھن لینے کے لیے آپ کو وہاں کا سفر نہ کرنا پڑے۔ تاہم یہ خیال رکھیں کہ ایندھن راستے ہی میں نہ ختم ہوجائے۔

• کار پارکنگ یا پبلک ٹیلی فون کی اجرت ادا کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کھلے پیسے اپنی جیب میں ضرور رکھیں، بصورت دیگر آپ کو مشکل صورت حال پیش آسکتی ہے۔

• تمام کاموں کے لیے ترجیحات کا تعین ضروری ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ کام کرنے والوں کو معلوم ہوجائے گا کہ کس کام کے لیے کتنی محنت کرنی اور کتنا وقت دینا ہے۔

• ہر کام کے لیے صحیح اور مناسب طریقۂ کار اختیار کرکے وقت بچایا جاسکتا ہے۔

• ہر کام کے لیے وقت کا تعین کرکے وقت کو بچایا جاسکتا ہے۔

• کام کا آغاز صبح سویرے کیا جائے۔ اس میں برکت ہے۔ جس طرح اور چیزوں میں برکت ہوتی ہے اسی طرح وقت میں بھی برکت ہوسکتی ہے لیکن اس کے لیے تقویٰ کی روش ضروری ہے۔ صبح اٹھنا اور اللہ سے برکت کی دعا کرنا ضروری ہے۔ رزق حلال اور صلہ رحمی ضروری ہے۔

• بعض معاملات میں انکار کردینا یا منفی جواب دینا مثلاً یہ کہہ دینا کہ یہ نہیں ہوسکتا، معذرت خواہ ہوں، ممکن نہیں، اصول کے خلاف ہے، میرے پاس وقت نہیں، کسی اور وقت رجوع کریں وغیرہ ضروری ہوتا ہے۔ کچھ لوگ اس رویے کو رواداری کے خلاف سمجھتے ہیں۔

• دو یا دو سے زیادہ کام بیک وقت کرنا مثلاً ناشتہ کرنا اور خبریں سننا، دفتر جاتے ہوئے سواری میں اخبار پڑھنا، چہل قدمی کرنا اور معمول کے وظائف کی تکمیل، جہاز کے سفر میں لکھنا پڑھنا وغیرہ۔ یہ عادتیں ایک دوسرے سے ٹکراتی نہیں ہیں بلکہ وقت کا بہتر استعمال ہیں۔ البتہ گاڑی چلاتے ہوئے ایس ایم ایس کرنا یا فون سننا وغیرہ آپ کے لیے حادثے کا باعث بن سکتا ہے۔ باہم متصادم چیزوں کو ایک ساتھ کرنے کی کوشش نہ کریں۔

• آپ کے سفر کی تیاری کی بھی ایک فہرست ہونی چاہیے۔

• چھوٹے چھوٹے کاموں کو ایک ہی وقت میں نمٹانے کی کوشش کیجیے۔

• غور وفکر اور تدبر وتفکر کے لیے بھی روزانہ کچھ نہ کچھ وقت ضرور مختص کیجیے۔

• ان مسائل کے بارے میں جو کہ آپ کے اوقات کو کھا جاتے ہیں یا آپ ان کا نام تساہل یا بیماری دیتے ہیں، انھیں حل کرنے کے لیے ماہرین کی مدد لیں۔ جو کام چند پیسے لے کر ایک کاریگر کرسکتا ہے، اس کام کو آپ خود کرکے اپنے وقت کو مت ضائع کریں۔

• اپنے سفری اوقات یا سیر کے اوقات کے دوران ٹیپ ریکارڈر

یا سمارٹ فون جیب میں رکھیں اور ائیرفون کان میں رکھ کر اپنی تربیت اور عبادت کی کوشش کیجیے۔

انتظار کے لمحات کو بہتر طور پر استعمال کرنے لیے اپنے پاس کتاب یا ممکن ہو تو ریکارڈنگ سننے کے لیے چھوٹا ٹیپ ریکارڈر یا موبائل کی سہولت سے فائدہ اُٹھائیں۔

• یومیہ شیڈول بک استعمال کیجیے اور اپنے اوقات کے مصارف تحریر کیجیے اور ہفتہ وار جائزہ لیجیے۔

• یومیہ کاموں کی ترجیحات ان کی اہمیت کے مطابق ترتیب دیجیے۔

• ہر کام اور منصوبے کے لیے ایک لائحہ عمل بنانے کی کوشش کیجیے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کیجیے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ایک ماہر فن تعمیر کی طرح پہلے نقشہ بنائیں گے اور پھر اس کے بعد تعمیر شروع کریں گے۔

• اہم ترین کاموں کو اوّل وقت میں کرنے کی کوشش کیجیے۔

• اپنے لیے قابل عمل مقاصد متعین کیجیے۔ ان مقاصد کی منازل بھی متعین کیجیے۔

• اہم اور مطلوبہ کاموں کو پہلے کریں۔ ان کے لیے بہترین وقت آپ کا پرائم ٹائم ہے۔

• اپنے ٹیلی فون اور موبائل فون کے وقت کو کنٹرول کریں۔ خیر خیریت اور حال احوال کی دریافت میں زیادہ وقت نہ لگائیں۔ صرف سلام میں ہی بہت بڑی سلامتی ہے۔

• اگر آپ پری پیڈ فون استعمال کرتے ہیں تو ہمیشہ اضافی کارڈ اپنی جیب میں رکھا کریں۔

• اپنی صحت، توانائی اور قوت کار کا خاص خیال رکھیں۔

• اس بات کی کوشش کریں کہ آپ کے اوقات کی ۵۰ فی صد مقدار اہم کاموں میں لگنی چاہیے۔

• ہر نماز کی ادائیگی کے بعد اپنا محاسبہ اور وقت کے استعمال کا جائزہ لیں اور اسے معمول بنائیے۔

• توازن اور اعتدال کی حدود میں رہیں۔ اس سے باہر نکلے تو افراط وتفریط کا شکار ہو جائیں گے۔

• تعلقات میں احتیاط کریں۔ فیس بک کی دوستیاں صرف وقت گزاری ہیں۔ ان میں دوست بہت کم ہوتے ہیں۔ ضرورت کے وقت محض فائدہ اٹھانے والے لوگوں کو دوست نہیں کہا جاتا۔

• اپنی چیزوں کو احتیاط سے مقررہ جگہ پر رکھیں اور اس جگہ کو اچانک تبدیل بھی نہ کریں۔

• اپنے معاملات کو تحریر کریں۔ اپنے خیالات کو تحریر کریں۔ اپنے کرنے کے کاموں کو تحریر کریں۔ اپنی وصیت تحریر کریں۔ جو چیزیں اور کاروباری معاملات اور اثاثہ جات گھر والوں کے علم میں نہ ہوں، انھیں لکھ لیں یا گھر والوں کو بتا دیں کہ کہاں رکھے ہیں۔ موت بتا کر نہیں آتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ آپ کے ورثا کو آپ کی دولت اور اثاثے کا علم ہو۔

• ہفتہ وار اور دیگر چھٹیوں سے بھرپور فائدہ اٹھائیں۔ ان میں گھر والوں کے ساتھ بطور تفریح وقت گزارنے کی شکل نکالیں۔

• اپنے اور اپنے خاندان کے ذاتی ریکارڈ کو ترتیب اور منظم طریقے سے رکھیں۔

• ہر فرد کے لیے ایک فولڈر بنائیں اور اس میں اہم کاغذات، جیسے برتھ سرٹیفکیٹ، بلڈ گروپ، میڈیکل ریکارڈ، تعلیمی ریکارڈ، شناختی کارڈ، پاسپورٹ اور دوسرے اہم کاغذات رکھے ہوں۔

• ٹیلی فون، بجلی، گیس، موبائل، انٹرنیٹ اور دیگر بلوں اور واجبات کے لیے ایک جگہ ضرور بنالیں۔

• اپنے آپ میں لچک پیدا کریں اور ضد اور ہٹ دھرمی سے بچیں۔

• افسوس کرنے، پچھتانے اور غم کرنے میں وقت نہ ضائع کریں۔

• ٹیلی ویژن پر خبروں اور اہم ٹاک شوز تک اپنے آپ کو محدود رکھیں تاکہ آپ کو اخبار کم سے کم پڑھنا پڑے۔ منتخب پروگرام دیکھیں۔ لغویات اور بے مقصد کاموں سے بچیں۔ بار بار چینل مت گھمائیے۔ ٹیلی ویژن یا انٹرنیٹ بغیر لگام کا گھوڑا ہے۔ اسے اپنے اوپر حاوی مت ہونے دیں۔ اسے کنٹرول میں رکھیں تاکہ وقت کے گھوڑے سے آپ گر نہ جائیں۔

• تعلیم اور مطالعے کے لیے ٹائم ٹیبل بنائیں اور اس پر سختی سے عمل کریں۔

• امتحان کے دنوں میں پریشان ہونے کے بجائے باقاعدگی سے مطالعہ کریں، اور نماز اور دُعا کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کیجیے۔

• مناسب آرام، اچھی صحت، متوازن غذا، باقاعدگی سے ورزش، منصوبہ بندی اور محنت کے ساتھ فرائض کی ادائیگی، تفکرات کی اللہ کو سپردگی، اللہ کی نعمتوں کا شکر اور محنت کے ساتھ توکّل اور دعا، یہ عناصر آپ کو ترقی دینے اور کامیاب بنانے میں اہم ہیں۔

معاشی زندگی: دفتر اور کاروباری اُمور

معاشی مصروفیات میں دفتری یا کاروباری معاملات اہمیت رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں درج ذیل اُمور کو پیش نظر رکھنا مفید ہوگا:

• جب آپ کوئی وقت مقرر کریں تو اس امر کا یقین کرلیں کہ دونوں فریق اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ صحیح وقت کیا ہے۔ اسے دوبارہ دہرا کر تصدیق کرنا بہتر ہے۔

• مقررہ مقام پر پہنچنے کے لیے سفر میں آپ کو جو وقت لگے گا اسے اس فاصلے سے ہم آہنگ کرلیں جو دونوں مقامات کے درمیان ہو۔ تاہم، ضروری ہے کہ کچھ نہ کچھ گنجایش غیر متوقع حالات کے لیے بھی رکھ لی جائے تاکہ مقررہ مقام پر بر وقت پہنچنے میں آپ کو کوئی دشواری نہ ہو۔ ٹریفک کا ہجوم اور وی آئی پی موومنٹ کو بھی پیش نظر رکھیں۔

• اگر آپ کوئی مقصد ایک خط لکھ کر یا ٹیلی فون کے ذریعے حاصل کرسکتے ہوں تو ذاتی طور پر متعلقہ لوگوں سے ملنے کی کوشش نہ کریں۔

• چھوٹے چھوٹے معاملات پر فیصلے جلد ہو جایا کریں تو اس سے وقت بچایا جا سکتا ہے۔

• بے جا مداخلت سے پرہیز کیا جائے تاکہ وقت بچایا جائے۔

• دوسروں کا وقت ضائع نہ کیجیے۔ دوسروں کو انتظار کی زحمت مت دیجیے۔

• تیزی سے کام کیجیے۔ اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ مار دھاڑ کے ساتھ کام کریں بلکہ سست روی اور سست رفتاری سے بچتے ہوئے اسے مقررہ وقت میں کرنے کی کوشش کیجیے۔ امتحان کے تین گھنٹوں میں جس کیفیت سے کام کیا جاتا ہے اسے ضرور ملحوظ رکھیں۔

• خطوط کو دیکھ کر فوراً فیصلہ کرلیں کہ اس پر کیا اقدام کرنا ہے۔

• ای میل کا جواب تحریر کر کے اس پر غور کیجیے۔ اگر کوئی جذباتی بات یا غیر مناسب جواب تحریر کرلیا گیا ہے تو اسے بھیجنے بد 268 سے پہلے اہتمام کے ساتھ بار بار دیکھیے۔ کوشش کیجیے کہ ایک رات گزرنے کے بعد جواب بھیجا جائے۔

• اپنی ای میل دن میں صرف دو بار چیک کریں۔ اگر ادارے کی ضروریات کی وجہ سے فوری جوابات ضروری ہوں تو اس میں لچک پیدا کرلیں اور ہر دو گھنٹے میں ایک بار دیکھ لیں۔

• شارٹ کٹ کے نظام کے ذریعے اپنے فون کرنے کے اوقات کو بچانے کی کوشش کریں۔

• کئی کالز کو جمع کر کے ایک وقت میں فون کرنے کی کوشش کریں۔

• عام معاملات میں فون پر کوشش کریں کہ تین منٹ میں بات ختم ہو جائے ورنہ پانچ منٹ سے زائد بات کرنا وقت کے ساتھ ظلم ہے۔

• میٹنگز کم از کم کرنے کی کوشش کریں اور وہ بھی ایجنڈے کے مطابق۔ میٹنگز کو ادارے کے مفاد کے لیے استعمال کیجیے۔ بحث و مباحثہ سے ٹیلی ویژن کے ٹاک شوز کا نعم البدل مت بنایئے۔

• دوپہر کا کھانا سادہ رکھیں اور کھانے کے بعد چند لمحات آرام کرلیں۔ یہ آپ کے لیے قوتِ عمل کا باعث ہوگا۔

• ہم ہر کام نہیں کرسکتے۔ ان مصروفیات پر توجہ دیجیے جو بہت اہم ہیں اور جن سے آپ کو زیادہ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ کم نفع مند کاموں کو مؤخر کرسکتے ہیں یا پھر کسی کو تفویض کر کے اس پر کچھ لاگت لگا کر بہتر طریقے سے کرا سکتے ہیں۔

• اپنے وقت کا ریکارڈ رکھیے اور جائزہ لیتے رہیے کہ کتنا کارآمد اور کتنا غیر کارآمد خرچ ہوا۔

• مناسب شیڈول بنایئے لیکن شیڈولنگ کے جال میں مت پھنسیئے۔

• کام میں حارج ہونے والی باتوں اور مداخلت کو کنٹرول میں رکھنے کی کوشش کیجیے۔

• اپنے پرائم ٹائم کی شناخت کیجیے اور اس سے بھرپور فائدہ اٹھایئے۔

• اپنے اہم کاموں کو اس وقت کرنے کی کوشش کیجیے جب آپ کے جسم میں قوت زیادہ ہو اور یہ آپ خود اپنا جائزہ لے کر معلوم کر سکتے ہیں۔

• وہ کام جن کو کرنے کی طبیعت نہیں چاہ رہی ہے (جائز کام)، انھیں کرنے کے لیے اپنے آپ پر جبر کر کے جلد از جلد کرنے کی کوشش کیجیے۔

• غیر متوقع کے لیے بھی تیار رہیے اور ان کاموں کو بھی اپنے شیڈول کا حصہ بنائیے جو غیر متوقع طور پر آ جاتے ہیں۔

• اپنے سفری اوقات کو استعمال کرنے کا فن سیکھیے۔ اگر آپ ۲۰ منٹ سے زیادہ کی ڈرائیو پر ہیں تو اس وقت کو بھی بہتر طور پر استعمال کرنے کی کوشش کیجیے اور دورِ حاضر کی ٹیکنالوجی سے بھرپور فائدہ اٹھائیے۔

• ۸۰/۲۰ کے قاعدے کے مطابق کام کیجیے۔ یعنی وہ کام خود کریں جن میں محنت کم اور استفادہ یا نتائج زیادہ ہوں۔

• جب بہت زیادہ کام آ جائیں تو اپنے کاموں کو تقسیم کرنے کی کوشش کریں۔ اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ کارڈز لیں اور اپنے کاموں کے دو گروپ بنالیں: آج کے کرنے کے کام اور وہ کام جو کل ہو سکتے ہیں۔ دو گروپ بنا کر کام کرنے کی کوشش کریں۔

• ترجیحات کا تعین ۸۰/۲۰ اُصول کے مطابق کریں۔

• بعض اوقات غیر ضروری سوچ اور بہت بڑی منصوبہ بندی بھی آپ کے کام میں رکاوٹ کا باعث بنتی ہے۔ ایسے صورت میں فوری عمل بھی فائدہ مند ہوتا ہے۔ تساہل آپ کو کام شروع کرنے سے روکتا ہے اور اکملیت آپ کو کام ختم کرنے سے روکتی ہے۔

• اپنے رویّے کو معتدل رکھیے۔

• ایک جیسے کام ایک جگہ جمع کرلیں۔

• اپنے موجودہ طریقۂ کام کا جائزہ لیں اور اس میں حسب ضرورت تبدیلی کریں۔

• کام کرنے کے فنکار بنیے۔ محض محنت کافی نہیں بلکہ بہترین طریقے سے کام کیجیے۔

• اپنے کاموں اور معاملات کی چیک لسٹ بنائیے۔

• بیک ورڈ شیڈول بنائیے، یعنی کام ختم کرنے کی مطلوبہ تاریخ سے پیچھے کی جانب منصوبہ بندی کیجیے۔

• چھوٹے چھوٹے کاموں کو ایک وقت میں نمٹائیے۔

• ہمیشہ اپنی ترجیحات پر توجہ دیں اپنی مصروفیات پر نہیں۔

• دوسروں کے اوقات کی قدر کیجیے۔

• فیصلے کرنے میں تاخیر نہ کیجیے۔

• اپنے دفتر کے ساتھیوں کا وقت ضائع نہ کیجیے۔

• اپنی ذاتی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لیتے رہیے اور اپنی اصلاح کرتے رہیے۔

• اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنا سیکھیں۔

• اپنے کاموں کو اپنے لیے رکاوٹ مت بنائیے بلکہ معاون بنائیے۔

• جو چیزیں اور معاملات عموماً تنگ کرتے ہیں ان کا حل نکالنے کی کوشش کیجیے۔

• ہمیشہ اپنے پاس بیک اپ پلان رکھیں جیسے آپ لوڈ شیڈنگ کے خطرے کے پیشِ نظر جنریٹر کا انتظام رکھتے ہیں۔

• اپنے اوقات کو پرائم اور نان پرائم ٹائم میں تقسیم کریں اور اس کا لحاظ رکھتے ہوئے کام کریں۔

• کاموں کے کرنے کے لیے وقت کے بلاگز بنالیں اور اس وقت میں تیزی کے ساتھ کرنے کی کوشش کریں۔

• جو کام کریں صحیح کریں۔

• جب کام ختم کرلیں تو پھر اسے سائڈ پر رکھ دیں اور بار بار اس پر نظریں نہ دوڑائیں۔

• اپنی جیب میں ہمیشہ کھلے پیسے بھی رکھیں۔ بعض اوقات ریزگاری کی پڑتی ہے۔

• اپنے معاونین کی ہمیشہ رہنمائی کرتے رہیں۔ ان کی عزتِ نفس کا ہمیشہ خیال رکھیں۔ انسانوں کے ساتھ غرور اور تکبر کا رویہ آپ کو بہت جلد بغیر سیڑھیوں کے زمین پر پہنچا دے گا۔

• میٹنگ سے پہلے ہمیشہ پچھلی میٹنگ کی روداد اور اگلی میٹنگ کا ایجنڈا بھیج دیں۔

• اپنے اسٹاف کی استعداد کار کا اندازہ بھی رکھیں اور ان کا خیال بھی رکھیں۔

• اپنے معاونین کو متحرک رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے رہیں۔
• میٹنگوں کی بجائے کانفرنس کال کرلیں یا اسکائپ کال کرلیں۔
• جہاں ضرورت ہو دیگر ساتھیوں سے مدد طلب کرلیں۔
• اپنے کام سے لطف اندوز ہوں۔ کام کو اپنی پسند بنالیں اور اسے اس حق کے مطابق کرنے کی کوشش کریں۔ زندگی کی جائز تفریحات سے فائدہ اٹھائیں۔
• اپنے کام کرنے کی جگہوں پر کنٹرول حاصل کریں۔
• ترجیحات کا تعین کریں اور ضبط تحریر میں لائیں۔
• ترجیحات کے تعین کے ساتھ متعلقہ تبدیلی لائیں۔
• ترجیحات کا تعین صلے کے مطابق کریں۔
• صحیح وقت پر کام کریں اور کام کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔
• مقاصد، یعنی گولز بنائیں اور کام مکمل ہونے پر خوشی کا اظہار کریں اور خدا کا شکر ادا کریں۔
• ایک جیسے کاموں کو مجتمع کرکے کرنے کی کوشش کریں اس صورت میں ہر کام کے لیے موڈ بنانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔
• بہتر طریقے سے کام دوسروں کو تفویض کریں۔
• معذرت کرنے کا فن استعمال کریں۔ جو کام نہیں کرسکتے اور جو کام آپ کے مقاصد کے مطابق نہیں ہے اس سے معذرت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ دوسروں کی دنیا بنانے کے لیے اپنی دنیا اور اپنی آخرت تباہ نہ کریں۔
• کاموں کا اور فاصلوں کا اندازہ لگائیں اور پلان بنائیں تاکہ صحیح وقت پر کام ختم کرسکیں۔
• سفر عقل مندی اور منصوبہ بندی کے ساتھ کریں۔ مقصدِ سفر واضح ہو۔ کاموں کی فہرست پہلے سے تیار ہو۔ ٹکٹ اور ہوٹل کی بکنگ کرلی گئی ہو۔ جن افراد سے ملنا ہے ان سے ملاقات کے اوقات طے ہوں۔ ان سے ملاقات کا ایجنڈا طے ہو۔ اس کے لیے آپ نے ہوم ورک کرلیا ہو۔
• بہتر کارکردگی کا مطالبہ کریں۔ اپنے ساتھیوں کو متحرک رکھیں۔ انھیں کام کے فوائد بتائیں۔ انھیں اس معاملے میں ان کے خوشگوار مستقبل کے بارے میں بتائیں۔
• 'خدا حافظ' کہنے کا فن سیکھیں۔ کچھ کاموں کو ترک کرنا سیکھیں۔ کچھ قربانیاں دینا سیکھیں۔
• تنظیم وقت اور گھر کے کام کاج کے لیے ٹولز استعمال کریں۔ یہ کارآمد اور وقت بچانے کا اچھا ذریعہ ہیں۔ جہاں ممکن ہو ٹولز کو اپنی ضرورت کے مطابق بنائیں۔
• اپنے آپ پر ذمہ داریوں کا بہت زیادہ بوجھ نہ ڈالیں۔ انسان خود بے وقوفی کرکے اپنے اوپر بوجھ لادتا ہے۔
• ایک وقت میں ایک چیز یا ایک کام کریں۔ بیل گاڑی یا ٹرانسپورٹ کنٹینر بننے کی کوشش نہ کریں۔
• جو کام شروع کریں اسے ختم بھی کریں۔ یہ ایک اچھی عادت ہے اور اس سے آپ کی کامیابی کے راز وابستہ ہیں۔ اس عادت سے آپ کی کارکردگی میں اضافہ ہوگا۔
• کام کے بھوت نہ بنیں۔ اچھے انداز میں کام کریں۔
• غلطیوں سے پاک کام کرنے کی کوشش کریں۔ احسن طریقے سے کام کریں کیونکہ یہ انسانوں سے مطلوب ہے۔
• ناممکن کاموں کو کرنے کی کوشش نہ کریں۔ اپنے قد سے چھوٹے ہونا یا بونا بننا ناممکن ہے۔ لیکن ایک یا دو انچ قد بڑھ سکتا ہے۔
• کرنے کے کاموں کی فہرست کو اپنے ساتھ بلکہ اپنے سامنے بھی رکھیں۔
• افراد کی تربیت کریں اور انھیں زیادہ سے زیادہ اُمور تفویض کریں اور آگے بڑھنے کا موقع دیں۔
• مداخلتی چیزوں کا جائزہ لیں اور انھیں دور کرنے کی کوشش کریں۔ اوقات کو ضائع کرنے والی چیزوں کا جائزہ لیں، مداخلتوں کا جائزہ لیں اور پھر انھیں دُور کرنے کی کوشش کریں۔
• اپنے ہر کام کے لیے ٹارگٹ دیں اور اس وقت میں اسے کرنے کی کوشش کریں۔
• اگر فون پر کام کیا جاسکتا ہے تو خط لکھنے اور ای میل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔
• غیر ضروری چیزوں کا مطالعہ نہ کریں اور اسی انداز سے روزانہ آنے والی ای میلز کو بھی فلٹر کرلیا کریں۔
• پہیہ دوبارہ ایجاد نہ کریں، جو چیزیں میسر ہیں ان سے فائدہ

اٹھائیے۔

• اپنے کام کے سلسلے میں کسی سے معاونت کی ضرورت ہے تو اسے ضرور حاصل کریں۔

• جب کسی کام میں کامیابی ہوجائے تو اس کی خوشی منائیے۔ رب کا شکر ادا کیجیے اور اپنے معاونین کو ان کی محنت پر حوصلہ افزائی کیجیے۔ انھیں کریڈٹ دیجیے۔ یقین کیجیے آپ کی قائدانہ صلاحیتوں کے لیے یہ بہت اہم ہے۔

• غیر متوقع چیزوں اور واقعات کا اندازہ لگائیے اور ان کے لیے بھی وقت نکالنے کی منصوبہ بندی کر لیجیے۔

• اپنے تضیع اوقات کا عمومی طور سے جائزہ لیتے رہیے اور اس سلسلے میں اپنی اصلاح کرتے رہیے۔

• اپنے حافظے کے ساتھ مہربانی فرمائیے اور نوٹ بک کا استعمال کیجیے۔ حافظے کو اہم چیزوں کے لیے رکھیے۔

• مختلف کاموں کے لیے وقت مقرر کیجیے اور ان اوقات میں ان کاموں کو کرنے کی کوشش کیجیے۔

• جب گھر یا دفتر سے خریداری کے لیے نکلیں تو مکمل فہرست کے ساتھ نکلیں تاکہ ایک ہی چکر میں بہت سارے کام ہوجائیں۔ ہمیشہ ماسٹر لسٹ اپنے پاس رکھیں۔

• دفتر کی عام گفتگو جسے چٹ چاٹ کہتے ہیں اور مزاحیہ چیزوں، کرکٹ اور واقعات پر تبصروں سے پرہیز کیجیے۔ اگر آپ کو اس کام میں مہارت ہے تو ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں شرکت کر کے آمدنی کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

• اپنے پاس کاموں کی 'جائزہ فہرست' (چیک لسٹ) بنا کر رکھیں۔ سفر کی چیک لسٹ، خریداری کی چیک لسٹ، پروگراموں میں شرکت کی چیک لسٹ وغیرہ۔

• اپنے گھر اور معاشی مقام میں فاصلہ کم کرنے کی کوشش کریں تاکہ آپ کے وقت کی بچت ہو۔

• دفتری زندگی میں جوابات کی ٹیمپلیٹ بنا لیں تاکہ بار بار آپ کو لکھنا نہ پڑے اور آپ ایک ہی ڈرافٹ کی ایڈیٹنگ کر کے اپنا وقت بچانے کی کوشش کریں۔

• کام کی منصوبہ بندی کریں پھر کام کریں۔ گاڑی چلانے سے پہلے منزل متعین کر لیں۔

• کام کرنے سے پہلے منطق کے سوالات اپنے آپ سے کریں۔ کیا؟، کیوں؟ کیسے؟ اور کب؟

• گھر پر کام مت لے جائیں اور گھر کو کام پر مت لائیں۔ جب کام پر آئیں تو گھر سے نشریاتی رابطہ کم از کم رکھیں اور جب گھر جائیں تو گھر والوں کے حقوق ادا کریں۔ دفتر والوں سے نشریاتی رابطہ کم کر دیں۔ شریک حیات اور بچے اور والدین آپ سے آپ کا وقت، آپ کی باتیں اور آپ کی مسکراہٹیں مانگتے ہیں۔ ان کے لیے اجنبی نہ بنیے۔

• خاص اور منتخب کام کریں، جن کے بغیر گزارہ ہو سکتا ہے اسے چھوڑ دیں۔

• وہ کام جو دماغی صلاحیت کا مطالبہ کرتے ہیں انھیں ان اوقات میں کریں جب آپ کا دماغ اس کام کے لیے تیار ہو۔

• ایک وقت میں ایک کام کریں۔

• اپنے یومیہ کاموں کے لیے ٹائم ٹیبل بنائیں۔

• قابل عمل مقاصد کا تعین کریں۔

خاندانی یا گھریلو زندگی:

• آپ خواہ کھانا پکا رہے ہوں، کوئی مضمون لکھ رہے ہوں یا تقریر کر رہے ہوں، تمام متعلقہ چیزیں کام شروع کرنے سے پہلے اپنے پاس رکھ لیں تاکہ آپ کو بار بار اٹھنا نہ پڑے۔ اسے تیاری کہتے ہیں اور یہ بڑی اہم چیز ہے۔

• اگر آپ کو کوئی کام ہو یا کہیں سے خریداری کرنی ہو تو تمام چیزیں ایک نوٹ بک کی صورت میں لکھ لیں اور اپنی سرگرمیوں کا پورا نقشہ تیار کر لیں تاکہ آپ کو دوبارہ سفر نہ کرنا پڑے اور کم سے کم فاصلہ طے کر کے آپ کا سارا کام مکمل ہوجائے۔

• خریداری کے لیے پہلے سے فہرست بنا کر جائیں۔ کوشش کریں کہ مختلف معمول کی خریداری کی فہرستیں بنی ہوئی ہوں اور انھیں بوقت ضرورت استعمال کیا جائے۔

• خریداری ایک مرتبہ کیجیے۔ ایک ہفتے میں ایک بار سے زائد خریداری دور حاضر میں تضیع اوقات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ خریداری کی فہرست بنا لیں اور ایک ہی بار یہ سب کام کر لیں، پٹرول اور گیس بھی اسی دوران میں حاصل کر لیں۔

• سہولیات کے بل وقت پر ادا کر دیجیے اور تاخیر کر کے آخری وقت میں مشکلات مت پیدا کیجیے۔

• اپنی سالانہ چھٹیوں کو اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ بہتر انداز سے گزارنے کی کوشش کریں۔ یہ شیشے کی گیند کی مانند ہیں اسے زمین سے ٹکرانے کا موقع نہ دیں ورنہ یہ گیند ٹوٹ جائے گی۔

• وہ چیزیں نہ خریدیں جن کے لیے آپ کو خصوصی توجہ کی ضرورت ہو۔ نقش ونگار والی اشیا صفائی کا وقت مانگتی ہیں۔

• اگر چیزیں سستی مل رہی ہیں مگر آپ کو ان کی ضرورت نہیں ہے تو آپ انھیں نہ خریدیں۔

• وہ چیزیں بھی نہ خریدیں جن کے لیے آپ کے پاس جگہ نہیں ہے، یا خصوصی جگہ کے اہتمام کی ضرورت ہوگی۔

• ہفتہ وار خوراک کا مینو بنالیں۔ مرغن اور مہنگی غذاؤں کی جگہ سادہ اور کم خرچ غذاؤں پر گزارہ کریں۔

• ضروری نہیں ہے کہ آپ برانڈیڈ فوڈ کھائیں۔ اس میں آپ کو غیر ملکی سرمایہ کاروں کو رائلٹی دینی پڑتی ہے۔ اس کے بجائے آپ اپنے دوستوں اور رشتے داروں کے ساتھ ہفتہ وار یا ماہانہ یا چھٹیوں کے دوران 'ون ڈش' پارٹی کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے اجتماعی فوائد ہیں۔

معاشرتی یا قومی زندگی:

• کسی دوست کو اطلاع دیے بغیر یا ٹیلی فون پر رابطہ قائم کیے بغیر اس سے ہرگز نہ ملیے۔ اسی انداز سے اپنے دوستوں میں اس کلچر اور عادت کو پروان چڑھانے کی کوشش کریں۔

• عام حالات میں بھی بغیر اطلاع کے کسی کے گھر اور دفتر نہ جائیں۔ یہ تہذیب اور شائستگی کے خلاف ہے۔ ہمیشہ فون پر اطلاع دے کر جائیں۔ اگر آپ بغیر اطلاع کے جاتے ہیں تو اس شخص کو آپ آزمائش میں ڈال رہے ہیں۔

• ایسے لوگوں سے بچیں جو بے مروت اور اتنے خود غرض ہوں کہ آپ کا وقت خواہ مخواہ ضائع کرنے کی کوشش کریں۔

• اپنے مشکل حالت میں اپنوں میں سے غیر اور غیروں میں سے اپنے دیکھنے کی کوشش کیجیے۔

• ٹیلی فون کے استعمال میں احتیاط کریں۔ بسا اوقات بہت ہی غیر ضروری باتیں سامنے آجاتی ہیں اور کبھی غیر متعلقہ باتیں اور تفصیل بیان کی جاتی ہے۔ ایسے مواقع پر حکمت سے کام لیتے ہوئے بات چیت کو مختصر کرنے کی کوشش ہونی چاہیے۔ بلا وجہ بھی اسے استعمال کرنا مناسب نہیں۔

• فضول گوئی سے اجتناب کر کے بھی وقت بچایا جا سکتا ہے۔

• وقت کی پابندی کیجیے اور جہاں تک ممکن ہو اپنے گھر، دفتر، معاشرے میں اور تقریبات کے حوالے سے لوگوں کو پابندی وقت کی ترغیب دیجیے۔

• عام گفتگو اور لوگوں کے ساتھ بے تکلفانہ بات چیت کو پانچ منٹ تک محدود رکھیے۔

●●

(بقیہ ص ۳۴ کا)

مسجدیں امن وسلامتی کا گہوارہ ہیں۔ ان میں اسلحہ کی نمائش اور تشدد کی کوئی گنجائش نہیں۔ نماز کی ادائیگی کے بعد مسجد سے باہر نکلتے وقت بایاں پاؤں باہر رکھتے ہوئے یہ دُعا پڑھیے: اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَسْئَلُکَ مِنۡ فَضْلِکَ ''اے اللہ! میں تجھ سے تیرے فضل کا طالب ہوں''۔ (مسلم: کتاب صلوٰۃ المسافرین، باب ما یقول اذا دخل المسجد، حدیث/ ۱۱۶۵)

حاصل تحریر: مسجد میں ہم احکم الحاکمین کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں لہٰذا لازم ہے کہ نہایت باادب رہیں۔ ہمہ تن اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہیں۔ کوئی ممنوع کام نہ کریں یعنی دُنیاوی معاملات، خرید وفروخت، ہنسی مذاق، شور وغل وغیرہ نہ کریں۔ بلند آواز سے دُنیاوی بات چیت تو کسی طرح بھی مسجد کے شایانِ شان نہیں۔ اس سے نہ صرف اللہ ورسول کی حکم عدولی ہوتی ہے بلکہ حاضرینِ مسجد کی عبادت میں خلل پڑتا ہے اور مسجد کا تقدس مجروح ہوتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ رویہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات سے لا پرواہی کے مترادف ہے۔

آیئے آج سے ہم عہد کریں کہ ہم مساجد کا کماحقہٗ احترام کریں گے اور تمام ممنوع کاموں سے، خصوصاً اُونچی آواز میں دُنیاوی بات چیت سے سختی سے اجتناب کریں گے۔

●●

جاوید چوہدری

توجہ کا کرشمہ

آپ اگر توجہ کی برکت کو انجوائے کرنا چاہتے ہیں تو اپنے روٹین میں فون کو محدود کر دیں اور اس کے بعد نتیجہ دیکھیں

''میرے پاس کوئی کرشمہ نہیں، میں دوائیں بھی بازار سے خریدتا ہوں، اپنی کوئی دوا نہیں بناتا اور نسخے بھی پرانے ہیں لیکن اس کے باوجود اللہ کا کرم ہے لوگوں کو مجھ سے شفا ہو جاتی ہے۔''

میں نے پوچھا: ''لیکن کیسے؟ اگر ساری چیزیں نارمل ہیں، آپ کی اسٹڈی بھی نارمل ہے، ادویات بھی مارکیٹ کی ہیں اور آپ خود بھی مکمل دنیادار ہیں تو پھر لوگ آپ پر مکھیوں کی طرح کیوں گر رہے ہیں؟''

ڈاکٹر صاحب نے ہنس کر جواب دیا: ''میں بھی اکثر اپنے آپ سے یہ پوچھتا ہوں اور مجھے عموماً اس کے دو ہی جواب ملتے ہیں۔ ایک یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے، اللہ جس پر کرم کرتا ہے اس کے لیے دنیا اور آخرت دونوں جہانوں کے دروازے کھل جاتے ہیں اور دوسرا شاید توجہ کا ہنر ہے۔'' وہ خاموش ہو گئے۔

مجھے ان کے دوسرے جواب نے زیادہ حیران کیا۔ میں ڈاکٹر صاحب کے بارے میں بتاتا چلوں۔ ڈاکٹر صاحب ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھے اور پورے ملک سے مریض مکھیوں کی طرح ان پر گرتے تھے۔ کلینک ایک بڑے ہال پر مشتمل تھا۔ مریض لائنوں میں لگ کر کرسیوں پر بیٹھ جاتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ریوالونگ چیئر پر بیٹھ جاتے تھے، پاؤں سے کرسی کھینچ کر ایک مریض کے سامنے آتے تھے، اپنا کان مریض کے منہ کے ساتھ لگا دیتے تھے، مریض اپنا مسئلہ بیان کرتا تھا، ڈاکٹر صاحب دوائی لکھ کر کاغذ اپنے اسسٹنٹ کو دے دیتے تھے، مریض سے فیس لے کر رقم دوسرے اسسٹنٹ کے حوالے کرتے تھے اور پھر کرسی کھسکا کر دوسرے مریض کے سامنے پہنچ جاتے تھے۔ وہ اس طرح پورے ہال کا چکر لگاتے تھے اور یہ چکر صرف ایک نہیں ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو دس دس مرتبہ پورے ہال کا چکر لگانا پڑتا تھا۔

مجھے میرے ایک بزرگ دوست ان کے پاس لے گئے تھے۔ میں نے بھی یہ منظر دیکھا تو متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ہم سارا دن ڈاکٹر صاحب کے ساتھ رہے۔ وہ شام کو فارغ ہوئے تو ہم نے ان کے ساتھ چائے پی۔ میں نے چائے کے دوران ڈاکٹر صاحب سے کامیابی کا فارمولا پوچھا اور ان کے ساتھ گفتگو شروع ہو گئی اور یہ گفتگو ''توجہ'' پر آ کر رک گئی۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا:

''مجھ پر اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہے، اس نے میرا پردہ رکھا ہوا ہے، دوسرا یہ کہ میں مریضوں کی بات توجہ سے سنتا ہوں، میں کرسی کھسکا کر مریض کے قریب پہنچتا ہوں اور پوری توجہ سے اس کی بات سنتا ہوں، آنکھ تک نہیں جھپکتا، وہ جب تک بولتا رہتا ہے میں سنتا رہتا ہوں۔ میں اس دوران نوٹس لیتا ہوں اور نہ دوا لکھتا ہوں۔ یہ جب اپنی بات مکمل کر لیتا ہے تو میں اس سے ایک دو سوال کرتا ہوں اور ان کے جواب بھی مکمل توجہ اور یکسوئی سے سن کر دوا لکھ دیتا ہوں۔ میرے خیال میں میری توجہ کے دوران ہی مریض آدھا ٹھیک ہو جاتا ہے اور باقی آدھا دوا اور اللہ کے کرم سے درست ہو جاتا ہے اور یوں میرا کام چل رہا ہے''۔

میں نے ان سے پوچھا: ''توجہ کے اندر کیا راز چھپا ہوا ہے؟''

وہ ہنس کر بولے: ''توجہ دنیا کا سب سے بڑا خزانہ ہے، آپ سوشل میڈیا کو دیکھ لو، فیس بک، یوٹیوب، انسٹا گرام، ٹویٹر، واٹس ایپ اور ٹک ٹاک دس (۱۰) کھرب ڈالر کی انڈسٹری ہیں۔ آپ اگر اس میں ٹیلی ویژن کو بھی شامل کر لیں تو یہ دنیا کی سب سے مہنگی انڈسٹری بن جائے گی۔ باقی تمام انڈسٹریز ان کے سامنے چڑیا کا انڈہ محسوس ہوں گی اور اس سوشل میڈیا انڈسٹری کی روح کیا ہے؟ توجہ۔ یہ پوری انڈسٹری صرف توجہ سے چل رہی ہے، اس کا ایلگورد ھم چوبیس گھنٹے ناظرین کی توجہ تلاش کرتا رہتا ہے۔ فیس بک اگر دیکھنے والوں کی توجہ کھینچنے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو یہ نمبر ون ہو جاتی ہے اور اگر لوگ ٹک ٹاک میں گم ہو جاتے ہیں تو یہ اربوں ڈالر کما لیتی ہے اور اگر انسٹا گرام لوگوں کی توجہ حاصل کر لیتی ہے تو اس کا ریونیو بڑھ جاتا ہے۔

ٹیلی ویژن کی انڈسٹری بھی پاگلوں کی طرح توجہ کے پیچھے دوڑ رہی ہے جس اسکرین کو زیادہ لوگ دیکھ رہے ہیں اس کی ویلیو میں

اضافہ ہوجاتا ہے اور جس کو کم دیکھا جاتا ہے وہ ریس سے آؤٹ ہوجاتا ہے۔ ہم خدا سے کیا مانگتے ہیں؟ ہم اس کی توجہ ڈیمانڈ کرتے ہیں اور اس توجہ کے لیے ہم روزانہ نماز بھی پڑھتے ہیں، تسبیح بھی کرتے ہیں، روزے بھی رکھتے ہیں، حج بھی ادا کرتے ہیں اور زکوٰۃ بھی دیتے ہیں۔ ہم خدا کی توجہ کے لیے ہزار، ہزار نفل پڑھتے ہیں اور نیکی کے کام بھی کرتے ہیں، ہماری ان عبادات اور ان ریاضتوں کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ صرف توجہ الٰہی۔ اللہ تعالیٰ ہماری طرف متوجہ ہوجائے اور ہمارا بیڑا پار ہوجائے، توجہ اتنی قیمتی ہوتی ہے۔

آپ اس کو بھی چھوڑ دیں، ہم روز سج دھج کر گھر سے کیوں نکلتے ہیں؟ اسٹوڈنٹ کلاس روم میں ٹیچر کی توجہ حاصل کرنے کے لیے کیا کیا نہیں کرتے؟ لڑکیاں لڑکوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے کیا کیا بندوبست کرتی ہیں اور لڑکے بھی لڑکیوں کو متوجہ کرنے کے لیے کیا کیا نہیں کرتے؟ ماتحت اپنے باس کو خوش کرنے کے لیے کیا نہیں کرتے اور باس اپنے باس کی توجہ کے لیے کس کس مرحلے سے نہیں گزرتے، سیاست دان عوام کی توجہ کے لیے کیا کیا پاپڑ نہیں بیلتے اور حتیٰ کہ بے چارے پالتو جانوروں کو بھی اپنے مالک کی توجہ کے لیے کیا کیا نہیں کرنا پڑتا؟ فلم سازوں، موسیقاروں، گلوکاروں، اداکاروں، صداکاروں، لکھاریوں اور مصور بے چاروں کو بھی توجہ کے لیے کیا کیا دکھ نہیں سہنا پڑتے؟ آپ ایڈورٹائزنگ کی انڈسٹری بھی دیکھ لیں، اس میں بھی لوگوں کی توجہ کے لیے کیا کیا نہیں کیا جاتا لہٰذا اگر کہا جائے دنیا میں جو بھی ہے وہ سب توجہ کا کھیل ہے تو یہ غلط نہیں ہوگا اور میں اپنے مریضوں کو دنیا کی یہ قیمتی ترین چیز دیتا ہوں۔ میں ان کی داستان، ان کا دکھ پوری توجہ سے سنتا ہوں چناں چہ یہ ٹھیک ہوجاتے ہیں، ان کا درد اور بیماری کم ہوجاتی ہے۔'' ڈاکٹر صاحب خاموش ہوگئے اور میں حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ تھوڑی دیر رک کر بولے:

''آپ نے شاید یہ بات نوٹ نہیں کی، میں اپنے کلینک میں کسی شخص کو موبائل فون استعمال نہیں کرنے دیتا، اول مریض یہاں موبائل فون نہیں لا سکتے اور اگر لے آئیں تو پھر یہ اسے آف کر کے جیب میں رکھتے ہیں یا پھر بیگ کے اندر۔ میں کسی شخص کو موبائل فون ہاتھ میں بھی نہیں اٹھانے دیتا۔ میں اپنا فون بھی صبح آٹھ سے نو، شام پانچ سے چھ اور رات نو سے دس بجے دیکھتا ہوں یعنی چوبیس گھنٹے میں صرف تین گھنٹے۔ میں اس کے علاوہ موبائل فون استعمال نہیں کرتا، میں ان تین گھنٹوں میں لوگوں کو رنگ بیک بھی کرتا ہوں، ان کے پیغامات کا جواب بھی دیتا ہوں اور دنیا بھر کی معلومات بھی اکٹھی کر لیتا ہوں۔ ان تین گھنٹوں کے علاوہ میری زندگی میں موبائل فون کی کوئی گنجائش نہیں اور آپ کو میرے اسٹاف کے پاس بھی موبائل نظر نہیں آئے گا۔ یہ صبح دفتر آ کر موبائل بند کر دیتے ہیں اور واپسی پر آن کر لیتے ہیں۔ یہ دن میں کسی بھی وقت موبائل فون نہیں کھول سکتے۔

ہمارے اس فارمولے کی وجہ سے بھی کلینک میں توجہ کا لیول بہت ہائی ہے، مریض بھی یک سوئی سے بات کر سکتا ہے، میں بھی توجہ کے ساتھ اس کا مسئلہ سن سکتا ہوں اور میرا اسٹاف بھی اسے صحیح دوا دے دیتا ہے جب کہ دوسرے کلینکس میں ڈاکٹر بھی فون پر مصروف ہوتے ہیں، مریض کے فون کی گھنٹی بھی بجتی رہتی ہے اور کمپاؤنڈر اور نرسنگ اسٹاف بھی دوا پر توجہ دینے کے بجائے فون پر لگے ہوتے ہیں نتیجتاً مریضوں کو غلط ٹیکے لگ جاتے ہیں اور یہ تڑپ تڑپ کر جان دے دیتے ہیں۔ حکومت اگر کلینکس اور اسپتالوں میں صرف فون کے استعمال پر پابندی لگا دے تو آپ یقین کریں مریضوں کی جان بھی بچ جائے گی اور یہ جلدی تندرست بھی ہوجائیں گے۔ ہماری ساری توجہ کیوں کہ فون پر ہوتی ہے لہٰذا ہمارے ۹۰ فیصد فیصلے غلط ہوجاتے ہیں۔

خانساماں اگر فون کان سے لگا کر کھانا پکائے گا تو اس کے پکوان میں ذائقہ کیسے آئے گا؟ حجام بال کاٹتے وقت فون سنے گا تو اس کی کٹنگ اچھی کیسے ہوگی؟ میں نے اسی وجہ سے فون کو اپنی زندگی میں بھی محدود کر دیا اور اپنے کلینک میں بھی۔ چناں چہ آپ اس کا نتیجہ دیکھ لیں، میرے ہاتھ اور کلینک دونوں میں شفا آ گئی۔ آپ بھی اگر توجہ کی برکت کو انجوائے کرنا چاہتے ہیں تو فون کو محدود کر دیں اور اس کے بعد نتیجہ دیکھیں، آپ کی گروتھ (ترقی) میں بھی اضافہ ہوجائے گا اور سکون اور صحت میں بھی۔ آپ کو پھر سونے کے لیے دوا کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ دوسرا آپ دوسروں کی بات توجہ سے سنا کریں، آپ کو زندگی میں کسی استاد یا یونیورسٹی کی ضرورت نہیں رہے گی۔ توجہ دنیا کا سب سے بڑا اثاثہ، سب سے بڑا خزانہ ہے، آپ اسے استعمال کریں اور پھر اس کرشمے کا رزلٹ دیکھیں، آپ حیران رہ جائیں گے۔''

●●

محرم الحرام کی حرمت اور اس کے روزے

ترتیب: صادق رضا مصباحی

محرم الحرم کی اصل عظمت وحرمت واقعہ کربلا کی وجہ سے نہیں بلکہ ماہِ محرم کی حرمت تو اللہ کے یہاں تو اس دن سے قائم ہے جس دن سے یہ کائنات بنی ہے، اس پر قرآن کریم میں آیت بھی موجود ہے

محرم الحرام ہجری تقویم کا پہلا مہینہ ہے جس کی بنیاد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ ہجرت پر ہے۔ گویا مسلمانوں کے نئے سال کی ابتدا محرم کے ساتھ ہوتی ہے۔ ماہِ محرم کے فضائل و مناقب صحیح احادیث سے ثابت ہیں، آئندہ سطور میں انہی پر گفتگو مقصود ہے۔

محرم، حرمت و تعظیم والا مہینہ:

قرآن مجید میں ہے: إِنَّ عِدَّةَ الشُّهورِ عِندَ اللهِ اثنا عَشَرَ شَهرًا في كِتٰبِ اللهِ يَومَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالأَرضَ مِنها أَربَعَةٌ حُرُمٌ ذٰلِكَ الدّينُ القَيِّمُ فَلا تَظلِموا فيهِنَّ أَنفُسَكُم (سورہ توبہ)

اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی کتاب (یعنی لوحِ محفوظ) میں مہینوں کی گنتی بارہ ہے، اسی دن سے جب سے آسمان وزمین کو اس نے پیدا کیا ہے۔ ان میں سے چار مہینے ادب واحترام کے لائق ہیں، یہی درست دین ہے لہٰذا ان مہینوں میں تم اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو۔

یعنی ابتدائے آفرینش ہی سے اللہ تعالیٰ نے بارہ مہینے مقرر فرما رکھے ہیں جن میں چار کو خصوصی ادب واحترام اور عزت وتکریم سے نوازا گیا۔ یہ چار مہینے کون سے ہیں، ان کی تفصیل صحیح بخاری وصحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث سے ہوتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زمانہ اپنی اسی حالت پر واپس لوٹ آیا ہے کہ جس پر وہ اس وقت تھا جب اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق فرمائی تھی۔ سال کے بارہ مہینے ہیں جن میں چار حرمت والے ہیں، تین تو لگاتار ہیں یعنی ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور چوتھا مضر قبیلے کا ماہِ رجب جو جمادی الآخر اور شعبان کے درمیان ہے۔ (بخاری: کتاب التفسیر، سورۃ التوبہ، حدیث/ ۴۶۶۲/ مسلم: کتاب القسامہ، باب تغلیظ تحریم الدماء، حدیث/ ۱۶۷۹)

مذکورہ حدیث میں دو باتیں قابل توجہ ہیں: ایک تو یہ کہ محرم بھی حرمت والے مہینوں میں شامل ہے اور دوسری یہ کہ زمانہ اپنی سابقہ حالت وہیئت پر واپس لوٹ آیا ہے۔ اس کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ دورِ جاہلیت میں بھی لوگ حرمت والے مہینوں کا احترام کرتے اور جنگ وجدل، قتل وغارت گری اور خون ریزی وغیرہ سے اجتناب کرتے تھے۔ البتہ اگر کبھی حرمت والے مہینے میں انہیں جنگ وجدل اور قتل وغارت گری کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ اپنے طور پر مہینوں کی تقدیم وتاخیر کر لیتے۔ اگر بالفرض محرم کا مہینہ ہے تو اسے صفر قرار دے لیتے اور (محرم میں اپنے مقصد پورے کرنے کے بعد) اگلے ماہ یعنی صفر کو محرم قرار دے کر لڑائی جھگڑے موقوف کر دیتے۔ قرآن مجید نے اس عمل کو نسیئ قرار دے کر زیادتِ کفر سے تعبیر فرمایا۔ (التوبہ: ۳۷)

جس سال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حج فرمایا، اس سال ذوالحجہ کا مہینہ قدرتی طور پر اپنی اصلی حالت پر تھا اس لیے آپ نے مہینوں کے اَدل بدل کے خاتمے کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا کہ زمانہ گھوم گھما کر اپنی اصلی حالت پر واپس لوٹ آیا ہے۔ یعنی اب اس کے بعد مہینوں کی وہی ترتیب جاری رہے گی جسے اللہ تعالیٰ نے ابتدائے آفرینش سے جاری فرما رکھا ہے۔

دونوں باتوں کا حاصل یہی ہے کہ محرم ادب واحترام والا مہینہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ادب واحترام والا بنایا جبکہ اس کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی حرمت کو جاری رکھا اور عرب کے جاہل بھی اس کا اس قدر احترام کرتے کہ احترام کے منافی کسی عمل کے جواز کے لیے کم از کم اتنا حیلہ ضرور کر لیتے کہ فرضی طور پر حرمت والے مہینے کو کسی دوسرے غیر حرمت والے مہینے سے بدل لیتے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے یہ بات از خود سمجھ آ جاتی ہے کہ ماہِ محرم کی حرمت وتعظیم کا حضرت حسین کے واقعہ شہادت سے کوئی تعلق نہیں اور وہ لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں جو اس مہینے کی حرمت کی کڑیاں واقعہ کربلا اور شہادتِ حسین سے ملاتے ہیں اس لیے کہ ماہِ محرم کی حرمت تو اس دن سے قائم ہے جس دن سے یہ کائنات بنی ہے۔ جیسا کہ سورۂ توبہ کی گزشتہ آیت يَومَ خَلَقَ

السَّمٰوٰتِ وَالأَرضَ سے واضح ہے۔

محرم کے روزوں کی فضیلت:

رمضان المبارک کے روزے سال بھر کے دیگر تمام روزوں سے افضل ہیں۔ البتہ رمضان کے ماسوا محرم کے روزوں کی فضیلت سب سے بڑھ کر ہے جیسا کہ درج ذیل صحیح احادیث سے ثابت ہے:

(۱) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **أفضل الصيام بعد رمضان: شهر الله المحرم وأفضل الصلاة بعد الفريضة: صلاة الليل**

(مسلم: کتاب الصیام: باب فضل صوم المحرم، حدیث ۱۱۶۳)

رمضان المبارک کے بعد اللہ کے مہینے محرم کے روزے سب روزوں سے افضل ہیں اور فرض نماز کے بعد سب سے افضل نماز آدھی رات (یعنی تہجد) کے وقت پڑھی جانے والی نماز ہے۔

(۲) صحیح مسلم ہی کی دوسری روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا: **أي الصلاة أفضل بعد المكتوبة وأي الصيام أفضل بعد شهر رمضان؟** فرض نمازوں کے بعد کون سی نماز سب سے افضل ہے اور رمضان المبارک کے بعد کون سے روزے سب سے افضل ہیں؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی جواب دیا جو مذکورہ حدیث (مسلم: حدیث ۱۱۶۳) میں مذکور ہے۔

(۳) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک آدمی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اگر رمضان کے علاوہ کسی مہینے میں، میں روزے رکھنا چاہوں تو آپ کس مہینے کے روزے میرے لیے تجویز فرمائیں گے؟ آپ نے فرمایا کہ اگر تو رمضان کے علاوہ کسی مہینے میں روزے رکھنا چاہے تو محرم کے مہینے میں روزے رکھنا کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا مہینہ ہے۔ اس میں ایک دن ایسا ہے کہ جس دن اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کی توبہ قبول فرمائی اور ایک قوم کی توبہ (آئندہ بھی) قبول فرمائے گا۔ (ترمذی: کتاب الصوم، باب ماجاء فی صوم المحرم، حدیث ۷۴۱)

یومِ عاشورا کے روزے کی فضیلت:

(۱) حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **وصيام يوم عاشوراء أحتسب على الله أن يكفر السنة التي قبله** مجھے اللہ تعالیٰ سے اُمید ہے کہ یوم عاشورا کا روزہ گزشتہ ایک سال کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا۔

(مسلم: کتاب الصیام، باب استحباب صیام ثلاثۃ ایام، حدیث ۱۱۶۲)

واضح رہے کہ ''عاشورا'' عشر سے ہے جس کا معنی ہے دس (۱۰) اور محرم کی دسویں تاریخ کو عاشورا کہا جاتا ہے۔ البتہ مذکورہ فضیلت دسویں تاریخ کے روزے کی ہے یا نویں کی، اس میں اہل علم کا شروع سے اختلاف چلا آتا ہے۔

(۲) ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قریش کے لوگ دورِ جاہلیت میں عاشورا کا روزہ رکھا کرتے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہ روزہ رکھتے تھے۔ پھر جب آپ مدینہ تشریف لے آئے تب بھی عاشورا کا روزہ رکھتے اور صحابہ کرام کو بھی اس دن روزہ رکھنے کا آپ نے حکم دے رکھا تھا۔ البتہ جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو عاشورا کی فرضیت ختم ہوگئی۔ لہٰذا اب جو چاہے یہ روزہ رکھے اور جو چاہے نہ رکھے۔ (بخاری: کتاب الصیام، باب صوم یوم عاشورا، حدیث ۲۰۰۳ / مسلم: کتاب الصیام، باب صوم یوم عاشوراء، حدیث ۱۱۲۵)

(۳) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ دورِ جاہلیت میں لوگ یوم عاشورا کا روزہ رکھا کرتے تھے اور اللہ کے رسول اور مسلمان بھی اس دن روزہ رکھتے۔ پھر جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **إن عاشوراء يوم من أيام الله فمن شاء صامه ومن شاء تركه**

عاشورا اللہ تعالیٰ کے دنوں میں سے ایک (معزز) دن ہے لہٰذا جو اس دن روزہ رکھنا چاہے، وہ روزہ رکھے اور جو نہ رکھنا چاہے وہ نہ رکھے۔ (مسلم: ایضاً، حدیث ۱۱۲۶)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دورِ جاہلیت میں قریش دسویں محرم کا روزہ کیوں رکھتے تھے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہوسکتا ہے کہ وہ ہر سال ماہِ محرم کی اس تاریخ کو بیت اللہ کو غلاف پہنایا کرتے تھے جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ ہی سے مروی ایک حدیث میں ہے (بخاری: حدیث ۱۵۸۲) لیکن اس پر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قریش غلافِ کعبہ کے لیے یہی دن کیوں خاص کرتے تھے؟ تو اس کا جواب (اور پہلے سوال ہی کا دوسرا جواب) یہ ہوسکتا ہے جو حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

دورِ جاہلیت میں قریش نے ایک ایسے گناہ کا ارتکاب کیا جوان پر بڑا گراں گزرا تو ان سے کہا گیا کہ تم لوگ عاشورا کا روزہ رکھو، یہ تمہارے گناہ کا کفارہ ہوجائے گا۔ پھر اس وقت سے قریش عاشورا کا روزہ رکھنے لگے۔ (فتح الباری: ج ۴، ص ۳۷۷، کتاب الصوم، باب صوم یوم عاشوراء)

(۴) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو دیکھا کہ یہودی عاشورا کے دن کا روزہ رکھتے ہیں۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ اس دن روزہ کیوں رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ یہ ایک اچھا (افضل) دن ہے اور یہی وہ دن ہے جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان کے دشمن (فرعون) سے نجات بخشی (اور فرعون کو اس کے لشکر سمیت بحیرۂ قلزم میں غرقاب کیا) تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے (بطورِ شکرانہ) اس دن روزہ رکھا (اور ہم بھی روزہ رکھتے ہیں) تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہم حضرت موسیٰ کے (شریکِ مسرت ہونے میں) تم سے زیادہ مستحق ہیں۔ چنانچہ آپ نے اس دن روزہ رکھا اور صحابہ کو بھی روزہ رکھنے کا حکم فرمایا۔ (بخاری: ایضاً، حدیث/ ۲۰۰۴ /مسلم: حدیث/ ۱۱۳۰)

(۵) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نہیں دیکھا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم دنوں میں سے دسویں محرم (یوم عاشورا) کے اور مہینوں میں سے ماہِ رمضان کے روزوں کے سوا کسی اور روزے کو افضل سمجھ کر اس کا اہتمام کرتے ہوں۔ (بخاری: ایضاً، حدیث/ ۲۰۰۶ /مسلم: ایضاً، حدیث/ ۱۱۳۲)

(۶) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عاشورا کے روز یہودی عید مناتے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ تم اس دن روزہ رکھا کرو۔ (بخاری: حدیث/ ۲۰۰۵ / مسلم: حدیث/ ۱۱۳۱)

(۷) حضرت ابوموسیٰ اشعری سے مروی مسلم ہی کی دوسری روایت میں ہے کہ اہل خیبر عاشورا کے روز، روزہ رکھتے اور اس دن عید مناتے اور اپنی عورتوں کو اچھے اچھے لباس اور زیورات پہناتے مگر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ تم اس دن روزہ رکھو۔ (مسلم: حدیث/ ۲۶۶۱)

(۸) حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ بنو اسلم کے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ لوگوں میں جا کر یہ اعلان کرے کہ جس نے کچھ پی لیا ہے، وہ اب باقی دن کھانے پینے سے رکا رہے اور جس نے کچھ نہیں کھایا، وہ روزہ رکھے کیونکہ آج عاشورا کا دن ہے۔ (بخاری: حدیث/ ۲۰۰۷

(۹) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دسویں محرم کا روزہ رکھا اور صحابہ کو بھی اس دن روزہ رکھنے کا حکم فرمایا تو لوگوں نے عرض کیا کہ اللہ کے رسول! اس دن کو یہود و نصاریٰ بڑی تعظیم و اہمیت دیتے ہیں۔ (یعنی ان کی مراد یہ تھی کہ آپ تو ہمیں یہود و نصاریٰ کی مخالفت کا حکم دیتے ہیں اور یوم عاشورا کے معاملے میں تو ان کی موافقت ہو رہی ہے۔) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **فإذا كان العام المقبل إن شاء الله صمنا اليوم التاسع** آئندہ سال اگر اللہ نے چاہا تو ہم نویں تاریخ کو روزہ رکھیں گے۔ ابن عباس فرماتے ہیں کہ اگلا سال آنے سے پہلے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے حضور حاضر ہو گئے۔
(مسلم شریف: حدیث/ ۱۱۳۴)

(۱۰) مسلم شریف کی ایک روایت کے لفظ یہ ہیں: **لإن بقيت إلى قابل لأصومن التاسع**
اگر آئندہ سال میں زندہ رہا تو ضرور نو کا روزہ رکھوں گا۔ (ایضاً)

●●

(بقیہ ص ۲۷ کا)

یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارا سردار فوت ہو گیا ہے، ان کا کوئی اور قائم مقام سردار ہمارے قبیلے میں سے مقرر فرمادیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنونجّار! اَنْتُمْ اِخْوَانِیْ وَ أَنَا نَقِيْبُكُمْ تم میرے بھائی ہو اور میں تمہارا نقیب ہوں۔ اسعد بن زرارہ کے بعد اب تم میری کفالت میں ہو۔ میں خود تمہارا خیال رکھوں گا اور تمہاری نگرانی کے حق ادا کروں گا۔ (اسد الغابہ: ج ۱، ص ۲۷)

کتنے سعادت مند تھے حضرت اسعد! بلا شبہ وہ اسم بامسمّٰی تھے جنہیں اپنے آقا و مولا کی اتنی شفقتیں عطا ہوئیں۔

●●

اسلامی معاشرہ اور خواتین

عالمہ نیاز اقصیٰ

قرآن نے عورت کو زوجہ کہا اور مرد کو زوج، زوج کا معنی ہے جوڑ، اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب تک دونوں کو اپنی اپنی حیثیت کے حسب حال یکساں ذمہ داری نہ سونپی جائے اس وقت تک عورت معاشرتی کردار ادا نہیں کر سکتی

عورت کو بیٹی کے روپ میں دیکھیں تو تاجدار کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے کہ جب آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرا اپنے ابا جان سے ملنے کے لیے آتی ہیں تو کائنات کے تاجدار اپنی بیٹی کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں، اپنی چادر بچھا دیتے ہیں اور شفقت سے ان کا سر چوم لیتے ہیں۔

(سنن نسائی: ج ۵، ص ۳۹۱، حدیث/ ۲۹۳۶)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ عمل اپنی نجی زندگی میں اپنی بیٹی کے ساتھ پیار کا مظاہرہ ہی نہیں بلکہ امت کے ہر فرد کی بیٹی کے ساتھ حسن سلوک کا درس دے رہا ہے کہ یہ بیٹی کا حق ہے جو والد کو ادا کرنا ہے۔ آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے دو بیٹیوں کو پالا، ان کی پرورش کی، ان کو نیک اور صالح کیا اور زندگی میں معزز مقام تک پہنچا دیا، میں اس کو جنت کی ضمانت عطا کرتا ہوں۔

(صحیح بخاری: کتاب الزکاۃ، ج ۲، ص ۵۱۴، حدیث/ ۱۳۵۲)

یہ تو بطور بیٹی کے عورت کا مقام ہے۔ اسی طرح بہن کا مقام ہے، بہن بھی بیٹی کی طرح ہوتی ہے، بہن کے وہ تمام تر حقوق ہیں جو اسلام بیٹی کو دیتا ہے۔ اس میں دلیل اور سند آیات میراث ہیں۔ وراثت میں جو حق ایک بیٹی یا دو بیٹیوں کا بنتا ہے جب بیٹیاں موجود نہ ہوں تو وہی حق بہنوں کا بنتا ہے۔ اس آیت مبارکہ سے پتہ چلا کہ بہن بیٹی ہی کے قائم مقام ہوتی ہے۔ پھر عورت کو بیوی کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ اسلام نے انتظاماً وانصراماً مرد کا درجہ عورت پر بلند عطا کیا۔ جیسے قرآن کا ارشاد ہے:

وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (البقرہ: آیت ۲۲۸)

مردوں کو ان پر فضیلت ہے۔

اس کا معنی یہ ہرگز نہیں کہ عورت مردوں کے مقابلے میں نیچ اور گھٹیا مخلوق ہے۔ یہ تصور اسلام کا نہیں ہو سکتا۔ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جس طرح مردوں کے حقوق ہیں اسی طرح کے حقوق عورتوں کے لیے بھی ان کے حسب حال انہیں حاصل ہیں۔ مردوں کے جو فرائض ہیں اسی طرح کے فرائض عورتوں پر ان کے حسب حال ہیں۔ رہ گیا ان کا موازنہ تو اللہ تعالیٰ نے ایک گنا مردوں کو فضیلت دی ہے اور فضیلت دینے کی وجہ یہ ہے کہ عورتوں کی تمام تر کفالت اور ضروریات کا انتظام مردوں کے سپرد ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا: الرجال قوامون علی النساء گویا یہ عورت کو سہولت دی ہے۔ اس آیت مبارکہ نے عورت کو کمانے سے نہیں روکا۔ عورت کو معاشرتی زندگی میں اقتصاد سے نہیں روکا۔ معاشی وسائل پیدا کرنے سے نہیں روکا۔ اپنی عصمت و عفت کی حدود اور اقدار کو ملحوظ رکھتے ہوئے آزادی دی ہے لیکن ذمہ داری مرد کے سر پر ٹھہرائی ہے اور مردوں کو انتظاماً ایک درجہ بلند کیا ہے۔ اس لیے کہ وہ کفیل ہیں۔ کفیل کا حق ہے کہ اسے انتظامی برتری حاصل ہو لیکن رہ گئے حقوق وفرائض تو اس میں دونوں برابر ہیں۔

لہٰذا جس طرح مردوں کو ان کے حقوق انہیں حسب حال درجہ عطا کرتے ہیں۔ اسی طرح عورتوں کے حقوق ان کے حسب حال ان کو بلند درجہ عطا کرتے ہیں۔ عورت کو ہم انفرادی حیثیت میں خواہ عائلی زندگی کے اعتبار سے یا تعلیمی، معاشرتی، سماجی، قانونی، آئینی اور دستوری اعتبار سے دیکھیں، جن جن اعتبارات سے دیکھیں تو اسلامی معاشرے کے اندر عورت ایک بھرپور کردار ادا کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اسلام عورت کو عضو معطل بنا کر ایک جگہ نہیں رکھ دینا چاہتا بلکہ عورت کو پورے معاشرے کی تشکیل کی ذمہ داری دیتا ہے۔ عورت اپنی ذات کے اندر پوری انجمن اور مکتب و مدرسہ ہے کیونکہ معاشرے کا ہر مرد اس کی گود میں پل کر نکلتا ہے۔ خواہ وہ حاکم ہے یا محکوم، امام حسن مجتبیٰ ہیں یا امام حسین عالی مقام۔ وہ غوث الوریٰ ہیں یا خواجہ اجمیر وہ بابا فرید الدین گنج شکر ہیں یا داتا علی ہجویری یا کوئی اور بلند مرتبہ کامل ہستی ہیں۔ وہ اس عورت کی گود سے ہی پل کر نکلتا ہے۔ اگر اس عورت کی گود کو تقدس نہیں دیا جائے گا تو اس عورت کی گود سے پل

کر نکلنے والا کبھی مقدس نہیں ہوسکتا۔ قرآن مجید نے عورت کو زوجہ کہا۔ مرد کو زوج کہا اور زوج کا مطلب ہے جوڑ، اور جوڑ اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک دونوں میں یکسانیت نہ ہو یعنی ایک ریڑھا یا تانگہ اس کے دو پہیے ہیں وہ جوڑ ہے۔ اگر پہیہ ایک بڑا ہو اور ایک چھوٹا ہو تو کیا ریڑھا اور تانگہ چل سکتا ہے؟ نہیں۔ اس کی رفتار اس وقت تک قائم نہیں ہوسکتی جب تک دونوں اپنے اپنے حسب حال یکساں نہ ہوں۔ اللہ رب العزت نے فرمایا:

یااَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّ خَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا (النساء: آیت ۱)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہاری پیدائش کی ابتدا ایک جان سے کی پھر اسی سے اس کا جوڑ پیدا فرمایا۔

عورت کو جوڑ کہنا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ جب تک دونوں کو اپنی اپنی حیثیت کے حسب حال یکساں ذمہ داری نہ سونپی جائے اس وقت تک عورت کا معاشرتی کردار ادا نہیں ہوسکتا۔

اس طرح بیوی کو دیکھتے ہیں تو اسلام نے بیوی کے ساتھ حسن سلوک کو مرد پر فرض قرار دیا ہے۔ فرمایا: **خیر کم خیر کم لاھلہ**
(جامع ترمذی، ابواب المناقب: ج ۵، ص ۷۰۹، حدیث ۳۸۹۵)

تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو اپنی بیوی بچوں کے ساتھ بہتر ہے (میں تم میں سب سے زیادہ اپنی ازواج اور اپنے بچوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا ہوں)"۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنی ازواج کے ساتھ حسن سلوک کا یہ عالم تھا کہ امہات المومنین حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت خدیجۃ الکبریٰ، حضرت حفصہ سے پوچھیں وہ کہتی ہیں کہ مثالی کردار جو آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ادا کیا وہ دنیا کا کوئی فرد نہیں ادا کرسکتا۔ یعنی عدل بین الازواج رکھا۔ حدیث مبارکہ ہے:

ان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارادہ سفرا کان اقرع بین النساء (صحیح بخاری: ج ۲، ص ۹۱۶، حدیث ۲۴۵۳)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب سفر پر جانے کا ارادہ کرتے تو قرعہ اندازی کرتے جس کا نام نکلتا اس کو ساتھ لے جاتے۔

یہ عورتوں کے ساتھ عدل کا تصور ہے۔ آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے گھروں کے اوقات کو بانٹتے، ایک ایک لمحہ ایک ایک دن ایک ایک رات ازواج مطہرات کے درمیان تقسیم کرکے گزارتے۔ روایات میں ہے: **کان یقسم بین ازواجہ**
(جامع ترمذی: ابواب النکاح، ج ۳، ص ۴۴۶، حدیث ۱۱۴۰)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وقت کو ازواج مطہرات کے درمیان تقسیم کرتے تھے۔

حتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات قریب آ گئی تو چلنا پھرنا اور منتقل ہونا ممکن نہ رہا۔ اس وقت بھی پوچھنے لگے کہ کل ہماری رات کہاں بسر ہوگی؟ اس حالت میں بھی متفکر تھے کہ میرے اوقات کی ترتیب میں بے عدلی نہ ہو جائے تو ازواج مطہرات نے مل کر حضرت عائشہ کے حجرے کو اپنا حق دے دیا۔ یہ ایثار اور حسن سلوک کی بات ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ہاتھوں کے ساتھ اپنی ازواج کے گھروں کے کام کاج میں شرکت کرتے اور ان کی معاونت فرماتے۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ہر روز عصر کے بعد ہمارے مابین حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف رکھتے، ہمارے ساتھ مزاح کی بات بھی کرتے، ہماری دل جوئی بھی کرتے۔ یہ ازواج کے ساتھ حسن سلوک ہے۔ یہ قرب اور مصاحبت کا موقع دیا جارہا ہے۔

جب بطور ماں عورت کو دیکھیں تو آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **الجنۃ تحت اقدام الامہات**
(دیلمی، مسند الفردوس: ج ۲، ص ۱۱۶، حدیث ۲۶۱۱)

لوگو! جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔

اس حدیث پاک میں دو نکتے قابل توجہ ہیں جو میں واضح کرنا چاہتا ہوں۔ پہلا یہ کہ یہ آیت بتارہی ہے کہ ہر مرد کی جنت کسی نہ کسی عورت کے قدم کے نیچے ہے۔ اس سے بڑھ کر کسی عورت کا مقام کیا ہوسکتا ہے کہ اللہ نے ہر مرد کی جنت کو کسی نہ کسی عورت کے قدموں سے منسلک کردیا ہے۔ وہ عورت کون ہے وہ اس مرد کی ماں ہے۔ مطلقاً فرمایا تمہاری جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔

گویا بطور ماں کے عورت کی یہ قدر و منزلت ہے۔ ایک صحابی پوچھتے ہیں یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ہم پر کس کا حق ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تمہاری ماں کا۔ اس نے پوچھا: حضور! ماں کے بعد کس کا حق ہے؟ فرمایا: ماں کا۔ پوچھا: اس کے بعد کس کا حق ہے؟ پھر فرمایا: ماں

کا۔ پھر کس کا؟ فرمایا تیرے باپ کا۔
(صحیح بخاری: کتاب الادب، ج ۵، ص ۲۲۲۷، حدیث ۵۶۲۶)

اللہ اور رسول کے بعد تین گنا ماں کا حق قرار دیا۔ چوتھا حق باپ کا قرار دیا۔ اس سے بڑھ کر معاشرے میں کسی عورت کے تقدس کا معیار کیا ہوسکتا ہے۔؟ مغربی فکر پر اپنے آپ کو اذیت میں مبتلا کرنے والی عورت جو آج اپنی ترقی کا راز مغربیت میں تصور کرتی ہے۔ میں ان محترم ماؤں بہنوں سے کہتا ہوں کہ مغرب کی ساری سوسائٹی میں عورت کے تقدس اور عظمت کا کوئی تصور نہیں۔ عورت اس عظمت کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی جو اسلام نے عورت کو عطا کی ہے۔ وہ تو عورت کے حق کے طور پر اولاد کی جنت ماں کے قدموں کے نیچے قرار دیتا ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ایک کا حق دوسرے کا فرض ہوا اور ایک کا فرض دوسرے کا حق ہوا۔ یہاں عورت کا حق تو آپ سمجھ گئے کہ بطور ماں کے اولاد کا حق ہے کہ وہ اس کی تعظیم بجا لائے تاکہ جنت کمائے لیکن کوئی فرض بھی بنتا ہے ماں کا وہ اس حدیث میں ہے۔ اگر اس حدیث کا خطاب مردوں سے ہو تو انہیں یہ بتایا جارہا ہے تمہاری جنت تمہاری ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ اگر اس حدیث کا خطاب ماں سے ہو تو پھر ماں کو جھنجھوڑا جارہا ہے اور اسے خواب غفلت سے بیدار کیا جارہا ہے کہ تمہاری اولاد کی جنت تمہارے قدموں کے نیچے ہے۔ ان کی ایسی پرورش کرو کہ جنت تک پہنچادو یا ایسی پرورش کرو کہ دوزخ تک پہنچادو۔

اس حدیث کا دوسرا رخ کبھی بے نقاب نہیں کیا گیا اور نہ ہی بیان کیا گیا۔ اگر اولاد بدتمیزی کرے تو مائیں انہیں یہ تو سناتی ہیں کہ تمہاری جنت میرے قدموں کے نیچے ہے۔ کاش! آج کی ماں اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا شروع کردے کہ اللہ کے رسول نے اولاد کی جنت ماں تیرے قدم کے نیچے رکھی ہے گویا تجھے ذمہ داری دی جارہی ہے کہ اے ماں! اگر تیری اولاد دوزخ میں جاتی ہے تو ذمہ دار تو ہے کہ اس کی جنت تو تیرے قدم کے نیچے تھی۔ اس کے باوجود کیوں دوزخ کے لائق بن گئی۔ ماں کی گود کی تربیت کی اہمیت بتائی جارہی ہے وہ مائیں جو بچپن سے اپنی اولاد کی تربیت کرتی ہیں تو پھر جنت ان کے دروازوں پر چلی آتی ہے۔ ایسی ماں ہو تو پھر کیسے بیٹے جنم لیتے ہیں۔؟ حضرت بابا فریدالدین گنج شکر کا ایک واقعہ سنیے۔

حضرت بابا فریدالدین گنج شکر کے سوانح نگاروں نے یہ واقعہ لکھا ہے کہ وہ اپنی والدہ کے بطن میں تھے۔ ان کی والدہ محترمہ بہت عابدہ زاہدہ متقی خاتون تھیں۔ انہوں نے بغیر اجازت کسی کا مال نہ کھایا تھا۔ ان کی ماں کے پیٹ میں حاجت ہوئی، باہر تشریف لے گئیں، وہاں بیر کا درخت تھا جس کے دو چار دانے گرے ہوئے تھے۔ مالک کا تو پتہ نہیں تھا کون ہے؟ ان کو طلب ہوئی اور وہ بیر کے دانے اٹھا کر کھانے لگیں۔ ابھی ان کا ہاتھ منہ کے قریب نہ پہنچا تھا کہ پیٹ میں جو بچہ تھا، اس نے تیزی سے حرکت کی اور وہ اتنی تکلیف میں مبتلا ہوگئیں کہ بیر کے دانے گر گئے اور کھا نہ سکیں۔ پھر وہ بچہ بابا فریدالدین گنج شکر کے روپ میں پیدا ہوا۔ ابھی بچپن میں تھے، غالباً نو دس سال کے۔ ایک روز ماں انہیں گود میں لے کر کھلا رہی ہے۔ والدہ فرمانے لگیں: دیکھ! جب تو میرے پیٹ میں تھا تو میں نے تیری خاطر کبھی ایک ناجائز دانہ بھی اپنے منہ کے قریب لے جانے کا تصور نہیں کیا تھا۔ میں نے عمر بھر جو خون تجھے مہیا کیا ہے وہ حلال ہے۔ ایک چھوٹا سا بچہ (بابا فریدالدین گنج شکر) مسکرا پڑا اور کہنے لگا: اماں جان! آپ درست فرمارہی ہیں لیکن ایک دن غلطی ہونے لگی تھی، جب آپ بیر کے دانے بغیر اس کے مالک کی اجازت کے کھارہی تھیں۔

جب مائیں اس قدر احتیاط سے چلتی ہیں اور تقویٰ وطہارت اور پرہیزگاری کو اپناتی ہیں، ہمہ وقت باوضو رہتی ہیں اور قرآن کی تلاوت ہر وقت کرتی ہیں تو بیٹا پیدا ہوتے ہی قرآن کی تلاوت کرتا ہے۔ جب مائیں ایسی ہوں تو بیٹا بابا فرید ہوتا ہے لہٰذا جب اولاد جوان ہوجائے اور ادب واحترام کو ملحوظ نہ رکھے۔ بڑھاپے میں آپ کا خیال نہ کرے تو بوڑھی مائیں شکوہ کرتی نظر آتی ہیں کہ ان کو ہوش تک نہیں کہ ماں کے حق کو پہنچانے، بے ادبی کے مرتکب ہوتے ہیں اور فلاں کے کہنے لگ کر ہمارے ساتھ گستاخی کے مرتکب ہوتے ہیں لیکن اے ماں! کاش اس وقت اپنے بیٹے کے کردار پر شکوہ کرنے سے پہلے اس کے بچپن کے وقت اپنے کردار پر نظر ڈالی ہوتی۔ جب اس کو سنوارنا تمہاری ذمہ داری تھی تو تم نے کس حد تک ذمہ داری کو نبھایا۔؟ کس حد تک قرآن کی تعلیم دی۔ اعلیٰ سے اعلیٰ اسکولوں میں اپنے بچے کو تعلیم دلوانے کے لیے تو کوشاں نظر آئی لیکن قرآن کی تعلیم دینے کے لیے پریشان نظر نہ آئی۔ آپ نے کب بتایا کہ ماں باپ کے حقوق کیا ہیں؟ جب پرورش

کی ذمہ داری تم پر تھی تو تم نے فرض نہیں نبھایا۔ جب ادب واحترام کی ذمہ داری اولاد پر آئی تو اس نے بھی فرض نہ نبھایا تو معاملہ برابر ہو گیا۔ اس لیے سوسائٹی میں ماں کا کردار بڑا اہم ہے۔ ماں، عورت اپنے اعتبار سے تو ایک فرد ہے لیکن وہ پوری سوسائٹی کے کردار کو تشکیل کرتی ہے کیونکہ سوسائٹی کا ہر فرد اس کی گود سے پرورش پا کر آتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ماں کے کردار کی بالواسطہ سوسائٹی کے سارے مردوں میں جھلک نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے عورت کی دینی تعلیم اور عصری تعلیم پر بھی ضروری توجہ دی ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا:

طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ

(سنن ابن ماجہ: ج۱ ص۸۱، حدیث ۲۲۱)

علم حاصل کرنا فرض ہے ہر مسلمان مرد اور عورت پر۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات کو ہی نہیں بلکہ اپنی صحابیات کو بھی تعلیم فرمائی۔ آج بعض لوگ اسلام کے تصور کو معاذ اللہ فرسودہ بنانے کے لیے اور نئی نسل کو اسلام سے باغی اور متنفر کرنے کے لیے اس امر پر زور دے رہے ہیں کہ عورت کو تعلیم کی حاجت نہیں تاکہ وہ جاہل رہے۔ کیا آپ ایک جاہل فرد سے توقع کرتے ہیں کہ وہ اپنے فرائض کو ذمہ داری سے نبھائے۔؟ ایک جاہل اپنے فرض کو ہی نہیں سمجھ سکتا اور اپنی ذمہ داری کو ہی نہیں جان سکتا تو وہ اسے نبھائے گا کیسے؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تعلیم و تربیت کے لیے ہفتے میں ایک دن مستقل طور پر خواتین کے لیے مقرر کر رکھا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خواتین کے اجتماع میں تشریف لے جاتے۔ (صحیح بخاری: کتاب العلم، ج۱ ص۵۰، حدیث ۱۰۱)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواتین کی وعظ ونصیحت اور تربیت کے لیے ایک دن اس لیے مختص کر رکھا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جب تک اس پر توجہ نہیں دی جائے گی تب تک پوری سوسائٹی کی تعلیم و تربیت کا اہتمام نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت عائشہ کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نصف دین کہا۔ فرمایا: عائشہ نصف دین ہے۔

کیا آپ آدھا دین بغیر حصول دین کے ہو گئیں۔؟ تقریباً آٹھ سو کے قریب حضرت عائشہ کے شاگرد تھے۔ انہوں نے حضرت عائشہ سے سنا۔ ان سے روایت کیا، بیان کیا، نقل کیا۔ ام المومنین کا علم کے باب میں اس قدر بلند مقام و مرتبہ ہے۔ حضرت عائشہ بہت بڑی عالمہ اور فاضلہ تھیں۔ آپ کی نظر قرآن و حدیث اور دینی علوم پر ہی نہیں تھیں بلکہ آپ شعر وادب کی ماہرہ بھی تھیں۔ انساب اور تاریخ کی ماہرہ تھیں، حتیٰ کہ میڈیکل سائنس کی ماہرہ تھیں۔ علم طب پر حضرت عائشہ کی گہری نظر تھی۔ علوم فنون میں بھی حضرت عائشہ کا بلند مقام تھا۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حفصہ کے لیے قرآن کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام فرمایا تھا۔ قرآن نے کہا:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

کیا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو لوگ علم نہیں رکھتے (سب) برابر ہو سکتے ہیں۔ (الزمر: آیت ۹)

جب قرآن پاک علم کی فضیلت بیان کرتا ہے تو کسی سطح پر عورت کو پیچھے نہیں رہنے دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کی عورتیں دینی اور فقہی اعتبار سے اپنا بھرپور کردار ادا کرتیں۔ سیاسی اور سماجی، آئینی اور دستوری زندگی اور دیگر اہم امور میں عورتوں کے مشورے شامل ہوتے تھے۔

حضرت عثمان غنی اور حضرت علی کے مابین جب حضرت عبدالرحمن بن عوف استصواب رائے کروا رہے تھے تو تاریخ کی کوئی بھی کتاب اٹھا کر دیکھ لیں، آپ نے مردوں کی طرح عورتوں کو بھی رائے میں شامل رکھا اور مقیم اور مسافر، عالم اور جاہل، مرد اور عورت، بیمار اور صحت مند ہر ایک سے رائے طلب کی۔ عورت ایک اکائی اور معاشرے کی ایک فرد ہے، اسے نظر انداز کر کے کسی بھی اعتبار سے سوسائٹی ترقی نہیں کر سکتی۔ صرف حدود اور کام اپنے اپنے متعین ہیں۔ ترجیحات بھی اپنی اپنی مقرر ہیں، ان ترجیحات کو ترک کر دیا جائے اور ان حدود کو پھلانگ دیا جائے تو نظام ہمیشہ باطل ہو جاتا ہے۔

سیدنا فاروق اعظم کا دور حکومت ہے۔ آپ عورتوں کے مہر کی حد مقرر کرنا چاہتے تھے کہ چار سو درہم سے زیادہ مہر مقرر نہ کیا جائے تو صحابہ اور صحابیات کے اجتماع میں سے ایک عورت کھڑی ہوئی اور کہنے لگی: اے امیر المومنین! جب اللہ نے ہمارے مہر پر حد مقرر نہیں کی تو آپ کو حق کس نے دیا ہے کہ آپ ہمارے مہر پر حد مقرر کریں۔

(مصنف عبدالرزاق: ج۶ ص۱۸۰، حدیث ۱۰۴۲۰)

اس دور کی عورتوں کا اجتہاد، بصیرت اور علم کے اندر گہرائی کا یہ عالم تھا کہ حضرت فاروق اعظم نے پوچھا: اے بہن! آپ کے پاس کیا دلیل ہے اس بات کی کہ اللہ نے حق مہر پر حد مقرر نہیں فرمائی۔

صحابیہ عرض کرنے لگیں: امیر المومنین! جب اللہ نے کہا:

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا۔

(النساء: آیت ۲۰)

اور اگر تم ایک بیوی کے بدلے دوسری بیوی بدلنا چاہو اور تم اسے ڈھیروں مال دے چکے ہو، تب بھی اس میں سے کچھ واپس مت لو۔ کیا تم ناحق الزام اور صریح گناہ کے ذریعے وہ مال (واپس) لینا چاہتے ہو؟۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مہر کی کوئی حد نہیں۔ جہاں تک بساط ہو دیا جاسکتا ہے۔ عورت کے رائے سن کر سیدنا فاروق اعظم نے اپنی رائے واپس لے لی اور فرمایا: مرد نے فیصلے میں خطا کی اور عورت صحیح نتیجے پر پہنچی۔

یہ سیدنا فاروق اعظم کی وسعت ظرف اور عظیم حوصلہ ہے۔ کاش ہمارے اندر بھی ایسی وسعت اور حوصلہ پیدا ہوجائے۔ دوسری طرف اس سے پتہ چلا کہ سماجی، معاشرتی، آئینی، دستوری اور سیاسی زندگی میں عورت کو اپنی حدود کے اندر رہتے ہوئے سوسائٹی میں کیسے بھرپور کردار ادا کرنا ہے۔

اسی طرح اللہ رب العزت نے اکتساب مال میں بھی عورت کو محروم نہیں رکھا۔ اللہ رب العزت نے فرمایا:

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (النساء: آیت ۳۲)

مردوں کے لیے اس میں سے حصہ ہے جو انہوں نے کمایا اور عورتوں کے لیے اس میں سے حصہ ہے جو انہوں نے کمایا۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰ اپنے دور کی مالدار عورت تھیں۔ عرب کے سارے مالداروں کی دولت ایک طرف اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ کا مال تجارت ایک طرف۔ اگر ان کا اکتساب مال اور تجارت کرنا ناجائز ہوتا تو کم از کم ایک عورت کا مال تجارت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود شام کی منڈیوں تک نہ جاتے، بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق بھی اسی بنیاد پر قائم ہوا تھا۔ جب حضور علیہ السلام دین اسلام کی تبلیغ فرما رہے تھے تو اوائل دور میں دس گیارہ سال تک حضرت خدیجۃ الکبریٰ کا مال خرچ ہو رہا تھا۔

معزز خواتین! آج عورتیں اسلام کے عطا کردہ اس کردار کو پہچانیں اور معاشرے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیں تا کہ ان کی عصمت وعفت بھی محفوظ رہے مگر افسوس! ہم اپنے کردار کے تعین کے لیے نہ قرآن حکیم سے روشنی لینا چاہتے ہیں، نہ سنت مصطفوی سے۔ ہم نے تو اپنا آئیڈیل مغرب کو بنا رکھا ہے۔ ہم افراط وتفریط کا شکار ہو گئے ہیں اور عورت کو عضو معطل کرنا چاہتے ہیں یا اس قیمتی متاع کو سڑکوں پر ننگا کرنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف ہم ان کے پردے اور عصمت کی بات کرتے ہیں۔ یہ تصور دیا جا رہا ہے کہ آخر عورت کو ضرورت کیا ہے کہ وہ باپردہ خاتون ہو۔ مغرب میں عورت پردہ نہیں کرتی تو کیا فرق پڑتا ہے؟ لیکن انہیں اس بات کی سمجھ نہیں ہے کہ جو قدر و منزلت عورت کو دین اسلام نے عطا کی ہے، وہ مغرب عطا نہیں کرسکتا۔ جتنی کوئی قیمتی شے ہوتی ہے اس کی حفاظت کا اس قدر انتظام کیا جاتا ہے اور جو سڑکوں پر عام پھینک دی جائے وہ چیز قیمتی نہیں بلکہ ردی ہے۔ سو پردے اور عصمت وعفت کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ عورت ایک قدر ہے، عورت ایک متاع ہے، عورت ایک نایاب دولت ہے۔ جس کو اسلام ہر صورت محفوظ کرنا چاہتا ہے اور اس کے تقدس، اس کی عصمت وعفت کو قائم رکھتے ہوئے سوسائٹی میں اس کے کردار کو بھرپور طریقے سے انجام دینا چاہتا ہے۔

اسلام کی تبلیغ میں بھی تاریخ میں عورتوں نے بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ آج کا دور اسلام کی نشاط ثانیہ کا دور ہے لہٰذا احیائے اسلام کی نشاط ثانیہ کے اس دور میں جو ذمہ داری مردوں کے کندھوں پر عائد ہوتی ہے وہ معزز خواتین اور میری ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں پر بھی عائد ہوتی ہے۔ آپ کو چاہیے کہ اپنے فرائض منصبی کو پہچانتے ہوئے اپنی اولاد کی تربیت کریں، اپنے گھر کے ماحول کو سنواریں، اپنی ذمہ داری کو اس طرح سے نبھائیں کہ احیائے اسلام کی اس تحریک میں آپ بھی برابر کا کردار ادا کرسکیں۔ خوشی اور غمی کے موقع پر بہت غلط رسوم ورواج ہمارے معاشرے میں پیدا ہو چکے ہیں۔ خواتین اگر سادہ زندگی کو شعار بنائیں اور سادہ زندگی کے خلاف اٹھنے والے بے بہا اخراجات، بے جواز رسوم ورواج کو اپنے اوپر بند کرنے کا عہد کرلیں تو سادگی کی زندگی کے لوٹ آنے میں ایک دن بھی نہیں لگے گا۔ یہ انقلاب اور تبدیلی عورت پر منحصر ہے۔

●●

کچھ نہ کچھ سیکھتے رہیے!

مولانا شاہد رضا نجمی ازہری

قصہ صدائے بازگشت کا

ایک حکیم اپنے بیٹے کے ساتھ شہر کی چٹانوں اور غم واندوہ کے ماحول سے دور شہر کے باہر نکلا، تاکہ اپنے بیٹے کو صاف ستھری فضا کے تلے زندگی کے مختلف نشیب وفراز سے واقف کرائے۔ دونوں کا گزر ایک ایسی گہری وادی سے ہوا جسے بلند وبالا پہاڑ گھیرے ہوئے تھے۔ چلتے ہوئے بچے کا پاؤں پھسلا اور وہ گھٹنوں کے بل گر پڑا۔ سخت تکلیف کے باعث زور سے چیخا اور کراہتے ہوئے 'آہ! آہ!' کی صدا بلند کی۔ اس کی زبان سے یہ صدائے آہ بلند ہوتے ہی وادی کے دوسرے کنارے سے اسی طرح چیخنے، کراہنے اور 'آہ!' کی صدا بلند ہوئی۔ بچہ اپنی تمام تر تکالیف بھول کر دہشت زدہ وادی کے کنارے کی طرف متوجہ ہوا اور بولا کہ تم کون ہو؟ پلٹ کر آواز آئی کہ تم کون ہو؟ بچہ مزید بے چین ومضطرب ہو گیا اور از حد چیخ کر بولا: میں تم سے سوال کر رہا ہوں، تم کون ہو؟ پھر اسی چیخ کے ساتھ پلٹ کر وہی آواز سنائی دی۔ بچہ حواس باختہ تلملا کر پھر پوری قوت سے چیخا: تم پاگل ومجنون ہو! جواب دینے کے بجائے سوال کر رہے ہو! اسی قوت سے پلٹ کر پھر وہی آواز آئی کہ تم پاگل ومجنون ہو!

حکیم پاس کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ بچے نے اپنے ہوش وحواس درست کیے اور اس کی طرف متوجہ ہوا۔ حکیم نے اپنی عادت کے مطابق حکیمانہ گفتگو شروع کی اور کہا: اب میں آواز دیتا ہوں، تم دیکھنا کہ پلٹ کر کیسی آواز آتی ہے؟ اس نے زور سے ایک لطیفانہ آواز لگائی: میں تمھارا احترام واکرام کرتا ہوں۔ اب وادی سے آواز بھی اسی طرح شیریں اور لطیفانہ انداز میں آئی کہ میں تمھارا احترام کرتا ہوں۔ بچہ لہجے کی اچانک تبدیلی پر حیران رہ گیا۔ ابھی وہ ورطۂ حیرت میں ہی تھا کہ حکیم نے پھر آواز دی: تم کتنے پُر لطف اور پُر بہار ہو!! جواباً وادی سے اسی ملائمت اور محبت کے ساتھ وہی آواز سنائی دی۔

بچہ یہ سن کر دہشت زدہ رہ گیا، لیکن پلٹ کر آنے والی آواز کا راز نہیں سمجھ سکا۔ حکیم نے اپنی حکیمانہ گفتگو جاری رکھی اور کہا: پیارے بیٹے! ہم اس طبعی ظاہرے کو فیزیائی دنیا یعنی 'صدائے بازگشت' سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہماری دنیوی حیات بھی اسی طرح ہے۔ یہ دنیا تمھیں اسی قدر دے گی جس قدر تم اسے دو گے اور جتنا تم اسے محروم تمنا رکھو گے وہ بھی تمھیں رکھے گی۔

زندگی تمھارے اعمال اور کاموں کا صاف وشفاف آئینہ ہے اور تمھاری اچھی اور بری باتوں کی بازگشت ہے۔

جب چاہو کہ دوسرا تم سے محبت کرے، تو تم بھی اس سے الفت ومودت رکھو۔

جب چاہو کہ دوسرا تمھیں عزت واحترام سے نوازے، تو تم بھی اسے تعظیم واکرام سے نوازو۔

جب چاہو کہ دوسرا تم پر شفقت ومہربانی کرے، تو تم بھی شفقت ونرمی سے کام لو۔

جب چاہو کہ دوسرا تمھاری خطاؤں اور عیوب کو چھپائے، تو تم بھی اس کی عیب پوشی کرو۔

جب چاہو کہ لوگ تمھاری نصرت وحمایت میں آگے بڑھیں، تو تم بھی ہمہ وقت ان کی اعانت ومدد کرو۔

جب چاہو کہ لوگ تمھاری باتیں اور مشورے غور سے سنیں اور سمجھیں، تو تم بھی ان کی باتیں اور مشورے غور سے سنو اور سمجھو۔

اس دنیا کے باشندگان سے ہرگز یہ توقع مت رکھو کہ وہ تمھاری حرکتوں پر صبر اور چشم پوشی سے کام لیں گے اور تم ان کی حرکتوں پر غیظ وغضب کا اظہار کرتے رہو گے۔ تمھیں ہی پہلے صبر وتحمل، چشم پوشی اور درگزری کے اوصاف اختیار کرنے ہوں گے۔

پیارے بچو! اللہ رب العزت کا یہی قانون مطلق ہے جو زندگی کے مختلف پہلوؤں پر منطبق ہے۔ یہی وہ نظام ابدی ہے جسے تم زندگی کے تمام نشیب وفراز میں نافذ پاؤ گے۔ یہی خلاصۂ حیات ہے اور یہی

اس دنیوی زندگی کی 'صدائے بازگشت' ہے۔ 'اَلْجَزَاءُ مِنْ جِنْسِ الْعَمَلِ'، 'كَمَا تَدِيْنُ تُدَانُ'۔ جزا کام کی مقدار ہی ملتی ہے اور جیسا کام کروگے جزا بھی ویسی ہی پاؤ گے۔

☆☆☆

محبت الٰہی کا بدلہ

جب اللہ رب العزت تمھارا حامی و ناصر ہو جائے، تو کون تمھارا مخالف و معاند ہو سکتا ہے؟ اور جب اللہ رب العزت کی رحمت تم سے روٹھ جائے تو کون تم پر دستِ شفقت رکھ سکتا ہے؟ جب محبتِ الٰہی کی لازوال دولت تمھیں مل جائے تو تم نے کیا کھویا؟ کچھ بھی نہیں!! اور جب تمھیں وہ عظیم دولت نہ ملے، تو تم نے کیا پایا؟ کچھ نہیں!! محبتِ الٰہی کے نتیجے میں حاصل ہونے والے فوائد بے شمار ہیں۔

جب اللہ رب العزت تم سے محبت فرمائے گا تو تمھاری محبت مخلوق کے دلوں میں ڈال دے گا۔ دنیا کی ہر مخلوق تمھیں اپنا محبوب بنالے گی اور خلقِ خدا کا تم سے محبت کرنا وہ عظیم سرمایہ ہے، جو ہر قیمت سے ماورا ہے۔

جب اللہ رب العزت تم سے محبت فرمائے گا تو تمھیں حکمت سے نوازے گا اور جو حاملِ حکمت ہے وہ کثیر بھلائیوں کا حامل ہے۔ حکمت کی بدولت انسان سعادت مند ہوتا ہے اور بلا حکمت شقاوت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ حکمت کی بنا پر انسان خوش بختی کے دسیوں مراتب پالیتا ہے اور حکمت سے دور رہ کر بدبختی کے دسیوں درجات میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اپنی حکمت آمیزی سے انسان دشمنوں کو بھی اپنا دوست بنالیتا ہے اور حکمت سے عاری ہو کر دوستوں کو بھی اپنا دشمن بنالیتا ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ حکمت ایسی عطائے خداوندی ہے جو ہر قسم کی قیمت کے دائرے سے باہر ہے۔ حکمت ایمان پر استقامت کے بدلے اور محبت الٰہی کے ثمرے کے طور پر اللہ کی جانب سے عطا کی جاتی ہے۔

اور جب اللہ رب العزت تمھیں حکمت سے نوازے گا تو تمھیں 'سکینہ' بھی بخشے گا۔ یعنی وہ تم سے رضا مند رہے گا، تمھیں فیروز بنائے گا، سکون و اطمینان، قوت ارادی، نفس پر کنٹرول، رائے کی درستگی جیسی عظیم اور بیش بہا نعمتوں سے تمھارا دامنِ مراد بھر دے گا۔

یہ وہ 'سکینہ' ہے کہ جب تمھیں حاصل ہو جائے تو تمھاری سعادت مندی کے لیے کافی ہے، گرچہ تمھارے پاس دنیا کی کوئی چیز نہ ہو۔ اور اگر حاصل نہ ہو تو تم حد درجہ شقاوت میں گرفتار رہو گے گرچہ پوری دنیا تمھارے تسلط میں آ جائے۔ انسان کو وافر مقدار میں مال و دولت، صحت و قوت، ذکاوت و دانش مندی دی جائے، مگر حکمت نہ دی جائے تو وہ بہت بڑا محروم و شقی ہے۔ اسی وجہ سے فرمایا گیا کہ اللہ رب العزت صحت و تندرستی، ذکاوت و دانائی، حسن و جمال اور مال و دولت اپنی کثیر مخلوق کو عطا فرماتا ہے، لیکن 'سکینہ' سے اپنے منتخب بندوں کو ہی نوازتا ہے۔

☆☆☆

بادشاہ ہارون رشید اور حضرت بہلول دانا کا واقعہ

بہلول دانا نے ایک دن بغداد کے قبرستان میں اپنے لیے ایک قبر کھودی اور اس کے اندر آرام سے سو گئے۔ سلطان رشید نے ایک حکم نامہ جاری کیا اور انھیں جلد تلاش کرنے کا حکم دیا۔ سپاہی فوراً بہلول کی تلاش میں لگ گئے۔ کچھ دیر تلاش و جستجو کے بعد انھیں تلاش کر لیا۔ اپنے ہاتھوں میں موجود نیزے کی نوک سے انھیں بیدار کیا۔ یہ بہلول ہیں، کیا یوں ہی کھڑے ہو جائیں گے؟ آنکھیں ملتے ہوئے لبوں کو جنبش دی۔ فرمایا: مجھے کیوں بیدار کر رہے ہو؟ سپاہیوں نے بہول کی باتوں پر کوئی توجہ نہ دی۔ انھیں پکڑا اور بادشاہ کے سامنے حاضر کر دیا۔ ہارون رشید نے مسکرا کر پوچھا: میرے سپاہیوں نے تمھیں بیدار کیا اور تم ان پر غضب ناک ہو گئے! کیا وجہ ہے؟

بہلول نے اپنے غیظ و غضب کی وجہ بتائی۔ فرمایا: میں خواب دیکھ رہا تھا کہ میں ایک ملک کا بادشاہ ہوں، میرے پاس فوجیں ہیں، محل ہے، خدمت گار ہیں اور مجھے عظمت و قوت حاصل ہے لیکن جب سپاہیوں نے بیدار کیا تو ہر چیز برباد ہو گئی۔ ہارون رشید نے ایک زور دار قہقہہ بلند کیا اور کہا کہ انسان اس بادشاہت پر کیسے بھروسا کر سکتا ہے جسے اس نے کبھی خواب میں دیکھا ہو؟ بہلول نے بادشاہ اور فوجیوں پر ایک نظر ڈالی اور جواباً فرمایا: بادشاہ محترم! میری خواب میں دیکھی گئی بادشاہت اور ظاہری زندگی والی آپ کی اِس بادشاہت کے مابین کیا فرق ہے؟ جب میں بیدار ہوا تو میری بادشاہت ختم ہو گئی اور جب آپ کا وصال ہوگا تو آپ کی بادشاہت ختم ہو جائے گی۔

☆☆☆

تلاوتِ قرآن کو اپنا وِرد بناؤ!

روزمرّہ کی جانے والی تلاوتِ قرآن کو 'ورد' کہا جاتا ہے۔ لغت میں 'ورد' پانی کے اس چشمے کو کہتے ہیں جہاں تشنہ لب آ کر سیراب ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے: "وَلَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ" (القصص: ۲۳) جب حضرت موسیٰ علیہ السلام شہرِ مدین میں پانی کے چشمے کے پاس پہنچے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تلاوتِ قرآن کو اپنا 'وِرد' بنا لینے سے دل کی تشنگی ختم ہوتی ہے اور روح ہر قسم کی آلودگی سے صاف وشفاف ہوجاتی ہے۔ اے اللہ! قرآن کریم کو ہمارے دلوں کے لیے پُر بہار، ہمارے سینوں کے لیے مہبطِ انوار اور ہمارے حزن وملال کے لیے فرحت وانبساط کا گہوارہ بنا!۔

☆☆☆

پرندے اور جانوروں کے لیے پانی کا اہتمام

سخت گرمی کے اِن ایام میں پرندے اور جانور عموماً پانی سے محروم ہوتے ہیں۔ ایسے میں اپنے گھروں کے آس پاس، بالکنی اور روشن دانوں پر پانی سے لبریز برتن رکھنے کا اہتمام کریں۔ شاید کوئی رعشہ بر اندام، جگر تشنہ پرندہ اڑتے ہوئے آئے اور رکھے ہوئے برتنوں سے پانی پی کر سیراب ہوجائے۔ بلاریب یہ عمل اللہ رب العزت کی بارگاہ میں از حد اجر وثواب کا باعث ہے۔ قَالُوْا: يَارَسُولَ اللهِ ﷺ! وَإِنَّ لَنَا فِي الْبَهَائِمِ أَجْرًا؟ فَقَالَ: فِيْ كُلِّ كَبِدٍ رَطْبَةٍ أَجْرٌ۔ (بخاری ومسلم) صحابۂ کرام عرض گزار ہوئے: یا رسول اللہ ﷺ! کیا جانوروں کو بھی پانی پلانے سے ہمیں اجر وثواب ملے گا؟ فرمایا: ہر تر جگر کے عوض اجر ہے۔

☆☆☆

باتوں سے خوشبو آئے

☆ کاش! میں جنت کے لائق ہوجاؤں! کاش خود جنت میرے جنتی ہونے کی آرزو کرے! اے اللہ! جنت الفردوس میں ہمیں اعلیٰ مقام عطا فرما!

☆ موت ہماری حقیقی جدائیگی نہیں ہے؛ کیوں کہ ہمیں آخرت میں ایک دوسرے سے ملنا ہی ہے۔ حقیقی جدائیگی تو یہ ہے کہ ہم میں سے ایک جنت نشیں ہو اور دوسرا جہنم بدوش۔ اے اللہ! جنت الفردوس میں ہم سبھی کو ایک ساتھ جمع فرما!

☆ خود اعتمادی اِس اعتقاد کا نام نہیں ہے کہ سبھی لوگ آپ سے متأثر ہوجائیں گے۔ خود اعتمادی اِس اعتقاد ویقین کا نام ہے کہ لوگوں کا متأثر ہونا یا نہ ہونا آپ پر اثر انداز نہیں ہوگا۔

☆ جب دریا کی طغیانی ساحل تک پہنچتی ہے تو مچھلی چونٹیوں کو کھا جاتی ہے۔ اور جب پانی خشک ہوجاتا ہے تو چونٹیاں مچھلیوں کو کھا جاتی ہیں۔ زندگی سبھی کو فرصت کے لمحات بخشتی ہے۔ بس تم اپنے لمحے کا انتظار کرو۔

☆ آپ کی شخصیت کی عمدہ تعریف یہ ہے کہ آپ نہ کسی سے افضل ہیں، نہ کسی کی مثل ہیں اور نہ ہی کسی سے کم تر ہیں۔

☆ دنیا تمھاری ماں کی طرح نہیں ہے؛ کہ تم دن میں اس پر غیظ وغضب کا اظہار کرو، چیخ وپکار کرو اور شام میں وہ تمھیں کھانے کے لیے آواز دے۔ دنیا تمھیں یوں ہی بھوکا پیاسا مرتا ہوا چھوڑ دے گی۔

☆ میرے ساتھ معاملہ دہی نہایت آسان ہے؛ تم مجھے احترام سے نوازو۔ میں بھی تمھیں احترام دوں گا اور تم سے زیادہ دوں گا۔

☆ اگر تمھارے پاس تم سے الفت ووارفتگی رکھنے والا گھرانہ ہے، چند صالح اور خوش طبع دوست ہیں، دسترخوان پر لذتِ کام ودہن کے لیے غذا موجود ہے اور سر پر چھت کی سائبانی ہے، تو تم اپنے تصورات وخیالات سے کہیں بڑھ کر مال دار ہو۔

☆ لوگ تین طرح کے ہوتے ہیں۔ بعض لوگ غذا کی مثل ہیں، جن سے کسی بھی حال میں بے نیازی نہیں ہوسکتی۔ بعض دوا کی طرح ہیں، جن کی ضرورت صرف وقتِ مرض ہوتی ہے۔ اور بعض مرض کے مشابہ ہیں، جو ہمہ وقت ناپسند ہوتے ہیں۔

☆ مجھے وہ لوگ بے حد پسند ہیں جن کا ہتھیار عقل ہے، زبان نہیں۔ جن کا فیصلہ کن وار خاموشی ہے، کثرتِ کلام نہیں۔

☆ اپنی باتیں بلند کرو، اپنی آوازیں نہیں؛ کیوں کہ پھولوں کی پیداوار بارش کے قطرات سے ہوتی ہے، بجلی کی صداؤں سے نہیں۔

☆ اپنی اولاد کو سچائی کی تعلیم دو۔ اس کے بعد سچائی انھیں ہر چیز سکھا دے گی۔

☆ ہم ایک عجب دنیا کے باشندگان ہیں، جہاں فقرا اور اغنیا سبھی میلوں چلتے ہیں۔ مگر فقرا کھانے کی تلاش میں اور اغنیا کھانے کو ہضم کرنے کی غرض سے۔

● ●

دینی، دعوتی، اصلاحی اور مذہبی سرگرمیاں

مولانا مظہر حسین علیمی

جامعہ حرا انجم العلوم مہاپولی بھیونڈی میں دوسالہ ڈپلو ما کورس اور نئے ہاسٹل کا افتتاح، امیر سنی دعوت اسلامی کا خطاب

۱۱؍جون بروز منگل سہ پہر چار بجے سنی دعوت اسلامی کے ادارہ جامعہ حرا انجم العلوم، مہاپولی بھیونڈی میں ایک نئے کورس کے آغاز پر ایک عظیم الشان پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں مختلف ریاستوں سے تحریک کے ذمہ داران اور نمائندہ مبلغین کے علاوہ ممبئی ومضافات کے مدارس کے اساتذہ، علما اور طلبہ کرام کی ایک کثیر تعداد شریک رہی۔ اس پروگرام کے دو سیشن تھے۔ پہلا سیشن بعد نماز عصر منعقد ہوا جس میں جامعہ حرا انجم العلوم میں شروع کیے جانے والے نئے دوسالہ ''ڈپلو ما کورس'' کا افتتاح کیا گیا۔ افتتاحی اجلاس میں جامعہ حرا کے چیئرمین اور امیر سنی دعوت اسلامی حضرت مولانا محمد شاکر نوری صاحب نے اس نئے کورس کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ آج اسلام کو مختلف چیلنجوں کا سامنا ہے، الحاد بڑی تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے اور اسلام کے حسین چہرے کو مسخ کر کے پیش کیا جا رہا ہے، اسلامی تعلیمات میں شکوک وشبہات پیدا کیے جا رہے ہیں اس لیے ایسے افراد تیار کرنا نہایت ضروری ہے جو ان چیلنجوں کا جواب دینے اور لوگوں کو مطمئن کرنے کے اہل ہوں۔ الحمدللہ! سنی دعوت اسلامی نے اپنے ادارے میں اس دوسالہ عربک ڈپلو ما کورس کا آغاز کیا ہے جس کے نصاب تعلیم کے طور پر وہ تمام چیزیں پڑھائی جائیں گی جس کی ضرورت ایک بہترین مبلغ وداعی اور عالم دین کو ہوتی ہے۔ امیر سنی دعوت اسلامی نے مزید کہا کہ اس کورس کے لیے جامعۃ الازہر قاہرہ مصر سے تعلیم یافتہ فارغین کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ اس کورس میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو رہنے سہنے کھانے پینے اور مطالعہ وتحقیق کی تمام اعلیٰ سے اعلیٰ سہولیات مہیا کرائی جائیں گی اور ہر طالب علم کو ماہانہ اسکالرشپ بھی دی جائے گی۔ واضح رہے کہ جامعہ حرا انجم العلوم نے اپنے کیمپس میں اس دوسالہ خصوصی کورس کے لیے ایک الگ سے عمارت مختص کی ہے چنانچہ اس پروگرام میں اس عمارت کا افتتاح بھی کیا گیا۔

بعد نماز مغرب پروگرام کے دوسرے سیشن کا آغاز ہوا جس میں محقق مسائل جدیدہ حضرت مفتی محمد نظام الدین رضوی مصباحی صدر شعبہ افتا و شیخ الحدیث الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کا خصوصی خطاب ہوا۔ مفتی صاحب نے تیس منٹ کے اپنے مختصر مگر جامع خطاب میں ایک داعی ومبلغ اور عالم دین کے لیے کن کن اوصاف اور خوبیوں کا حامل ہونا ضروری ہے، اس پر بھرپور انداز میں روشنی ڈالی۔ انہوں نے ایک اہم بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک بہترین عالم دین کے لیے محض وسعت مطالعہ، دقت نظر اور وسعت فکر ہی کافی نہیں جب تک کہ فہم کلام پر قدرت حاصل نہ ہو۔ بہت سارے پڑھے لکھے اور اصحاب فکر اور اصحاب مطالعہ لوگ بھی فہم کلام پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے دھوکہ کھا جاتے ہیں اور وہ عبارتوں کا مطلب اور مصنف کی مراد نہیں سمجھ پاتے۔ مفتی صاحب قبلہ نے اس ذیل میں کئی مثالیں دیں اور اپنے تجربات ومشاہدات سے بھی اپنی گفتگو کو مزین کیا۔

امیر سنی دعوت اسلامی نے اپنے خطاب میں طلبہ وعلما کو سمجھایا کہ کسی بھی چیز کے لیے اخلاص کتنا ضروری ہے۔ اگر اخلاص نہ ہو تو کسی بھی چیز کو کما حقہ حاصل نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس کے تقاضے پوری کیے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ عام طور پر شاگرد اپنے استاد کے لیے راہ ہموار کرتا ہے اور لوگوں کے سامنے اس کی عظمت کے گن گاتا ہے اور اس کی عزت واحترام کے آداب اور تقاضوں پر

بات کرتا ہے۔اسی طرح ایک مرید اپنے پیر اور شیخ کے لیے یہی کام کرتا ہے تاکہ پیر صاحب یا استاد صاحب جب عوام الناس کے حلقے میں پہنچے تو ان کی شایان شان عزت کی جائے ،ان کے احترام میں کوئی کمی نہ رکھی جائے لیکن قربان جایئے ہمارے پیارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتوں اور رفعتوں پر کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آداب اور ان کی شان واحترام کا چرچا نہ صرف صحابہ نے کیا بلکہ خود اللہ عزوجل نے قرآن مجید میں جگہ جگہ ان کی رفعت و بلندی کے تذکرے کیے ہیں۔

اس پروگرام میں عالمی نعت خوان اور مبلغ سنی دعوت اسلامی محترم قاری رضوان صاحب نے بھی اپنی پرسوز آواز سے نعت نبی پیش کی جب کہ نظامت کے فرائض جامعہ حرا انجم العلوم کے استاد مولانا عظمت اللہ مصباحی نے انجام دیے۔اخیر میں امیر سنی دعوت اسلامی نے ملک کی مختلف ریاستوں سے آئے تحریک کے ذمہ داران ،نمائندہ مبلغین،تحریک کا تعاون کرنے والے حضرات اور روز اول سے تحریک سے وابستہ رہنے اور قدم قدم پر تحریک کو فروغ دینے والے حضرات کا شکریہ ادا کیا اور ان کی عزت افزائی کے لیے انہیں شال پیش کی۔جامعہ حرا کے کیمپس میں واقع حرا انگلش اسکول، ہوسٹل، کینٹین اور نئے تعمیر ہونے والے ہوسٹل کا معائنہ بھی کرایا گیا جسے دیکھ کر تمام مہمان بہت خوش ہوئے۔عصری علوم حاصل کرنے والے طلبہ کے لیے دینی و دنیاوی تعلیم ہاسٹل میں رہ کر حاصل کرنے کا انتظام کیا گیا ہے، ہاسٹل میں رہنے والے طلبہ کی سہولیات کا بھر پور خیال رکھا گیا ہے، صلاۃ وسلام پر یہ پروگرام ختم ہوا۔اخیر میں تمام مہمانوں کا عشائیہ پیش کیا گیا۔

● ●

دودھ بازار ممبئی میں ذکر شہدائے کربلا

۷ا جولائی ۔(ممبئی) محسن اعظم نیاز کمیٹی و مدرسہ قادریہ چشتیہ دودھ بازار ممبئی ۳ کے زیر اہتمام حسب سابق اس سال بھی ذکر شہدائے کربلا کی محفل منعقد ہوئی جس کا آغاز تلاوت کلام اللہ سے کیا گیا پھر مبلغ سنی دعوت اسلامی الحاج محمد سراج بغدادی نے نعت ومنقبت کے نذرانے پیش کیے۔بعدہ آج کا خصوصی خطاب داعی کبیر امیر سنی دعوت اسلامی حضرت مولانا محمد شاکر نوری کا ہوا۔آپ نے سامعین کو نہایت اہم پیغامات عطا فرمائے۔آپ نے کہا کہ اولاد کی تربیت میں ماؤں کا کردار بہت نمایاں ہوا کرتا ہے، جتنے بھی اولیاء اللہ گزرے ہیں چاہے غوث پاک ہوں،خواجہ اجمیری ہوں یا دوسرے اولیا، ان کی تربیت میں ان کی ماوں کا کردار مثالی رہا ہے، سید الشہدا حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خاتون جنت شہزادی رسول حضرت فاطمہ زہرا کی گود میں تربیت پائی تھی جس کی بنیاد پر وہ کربلا میں ثابت قدم رہے۔آج کامیابی کے الگ الگ معیار بیان کیے جاتے ہیں لیکن آیئے دیکھیں کہ قرآن کی روشنی میں کامیاب کون ہے؟ قرآن کہتا ہے ”کامیاب وہ ہے جو جہنم سے بچا کر جنت میں داخل کر دیا گیا“۔امام حسین رضی اللہ عنہ کے پیش نظر یہ آیت بھی تھی ،آپ نے راہ خدا میں اپنی زندگی قربان کر کے دائمی کامیابی حاصل فرمالی اور اپنے نانا کے دین کو بھی بچا لیا۔مولانا موصوف نے کہا کہ ہر شخص کی موت کا وقت اور جگہ مقرر ہے کوئی اس سے راہ فرار اختیار نہیں کرسکتا لیکن وہ موت کتنی قابل رشک ہے جو دین کی حفاظت میں قربان ہوجائے۔امام حسین اور ان کے رفقا نے شہادت کو قبول کرلیا لیکن ظالم کے سامنے جھکنا پسند نہیں کیا کیوں کہ قرآنی تعلیم آپ کے پیش نظر تھی۔امیر سنی دعوت اسلامی نے قرآنی آیات کی روشنی میں مشکلات میں صبر کرنے اور تقوی اختیار کرنے کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے فرمایا کہ امام حسین اگر کسی کے خلاف ایک لفظ بھی بول دیتے تو اس کا تباہ ہوجانا یقینی تھا لیکن آپ نے اپنے معاملے کو اللہ کے سپرد کر دیا اور دامن صبر کو مضبوطی سے تھامے رکھا جس کے نتیجے میں اللہ نے آپ کو دائمی زندگی عطا فرمادی، چودہ سو سال سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی دنیا بھر میں امام حسین اور ان کے رفقا کا محبت سے تذکرہ کیا جاتا ہے اور یزیدیوں کا انجام کتنا ہولناک ہوا وہ تاریخ کے صفحات میں موجود ہے۔صلوۃ وسلام اور دعا پر اس نورانی محفل کا اختتام ہوا۔

● ●

منظومات

حمد باری تعالیٰ

قلب مغموم سے ہر رنج مٹاتا تو ہے
روح میں خوشبوئے ایمان بساتا تو ہے

میرے ارمانوں کی محفل کو سجاتا تو ہے
مجھ سے عاصی کو کرم کر کے نبھاتا تو ہے

شکر تیرا ہو ادا کیسے اے رحمن ورحیم
میرا ہر عیب زمانے سے چھپاتا تو ہے

تو ہی مشکل کو بدل دیتا ہے آسانی میں
بات بگڑی ہوئی اک پل میں بناتا تو ہے

تیری قدرت کا نمونہ ہے نظام عالم
ایک کے رنگ میں سو رنگ دکھاتا تو ہے

تیری عظمت کا ثنا خواں ہے ذرہ ذرہ
ڈالیوں پہ گل خوش رنگ کھلاتا تو ہے

فہم ودانش سے ورا ہے تری رفعت مولیٰ
عقل انسان وملک میں کہاں آتا تو ہے

نعمتیں اتنی ہیں تری کہ نہیں جن کا شمار
عقل وحکمت کے خزانوں کو لٹاتا تو ہے

رونق صبح ومسا میں ہے تجلی تیری
شان خورشید وقمر میں بھی دکھاتا تو ہے

سینہ سنگ سے چشمے کو کرے ہے جاری
اورصدف میں درنایاب سجاتا تو ہے

کیوں نہ مشغول رہے حمد میں تیری ہر دم
سانس عارفؔ کی جو چلتی ہے چلاتا تو ہے

(نتیجہ فکر: غیاث الدین احمد عارفؔ مصباحی)

حمد باری تعالیٰ

اے خدائے جمال و زیبائی
خوب ہے تیری عالم آرائی

تو کہاں ہے کہاں نہیں ہے تو
محوِ حیرت ہے تابِ گویائی

سب میں موجود اور سب سے جدا
کون سمجھے یہ رازِ تنہائی!

پارہ پارہ قبائے استدلال
ریزہ ریزہ ہے دامِ جویائی

کیا نظر آئے ما سوا کا جہاں
دیکھ کر تیری شانِ یکتائی

یاس میں، غم میں اور مشکل میں
تیری رحمت ہی سب کے کام آئی

اعظمؔ اس نام سے ہے گلشن میں
زندگی، تازگی و رعنائی

(نتیجہ فکر: محمد اعظمؔ چشتی)